

U'64332,

Title - MASAILA - E - KHLAPAT - O - JAZEERA - E - ARAB
creator - Abdul Kalam Azad.

Publisher - At Belaghi Press (Calcutta).

Date - N.A.

Pages - 160

Subjects - Islam - Masail-e-Khilafat ;
Islam ; Khilafat - Azad ; Abdul Kalam ;

Language - Urdu - Azad .

CALL No.

2965.2
{ 2965.2 }

ACC. No.

12332

AUTHOR

TITLE

IBULKALIM 42 41)

IBULKALIM 42 41)

Date

No

Date

No



MAULANA AZAD LIBRARY ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY

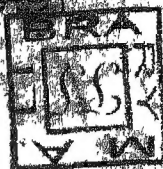
RULES:-

1. The book must be returned on the date stamped above.
2. A fine of Re. 1/- per volume per day shall be charged for text-books and 10 P. per vol. per day for general books kept over-due.

طبعہ اللہ واطبعہ السؤل واولی الامر

سلسلہ مطبوعات سلسلہ خلافت

نمبر (۱)



مسئلہ خلافت و جزیرہ عرب

یمنی

مولانا ابوالکلام کا خطبہ صدرارت جو انھوں نے پراونشیل خلافت کانفرنس بمبائل منعقدہ ۲۸-۲۹-۳۰ فروری ۱۹۳۲ء کلکتہ میں دیا۔ اب آل انڈیا خلافت کمیٹی کے شعبہ تبلیغ اشاعت دکلکتہ کی جانب سے رسالہ کی شکل میں شائع کیا جاتا ہے۔

تم مسلمان جو ایک زمانے میں اللہ اور اس کے دین برحق کے لئے سب کچھ کر سکتے تھے، کیا اب اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ اس کے احکام اس کے غافل بندوں تک نہ پہنچا دو؟ تم کو چین سے نہیں بیٹھا جائیے جب تک کم از کم دس مسلمانوں تک وہ اس حکم نہ پہنچا دو جو اس رسالہ میں درج ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک کو نصیحت کرو کہ اسی طرح دس آدمیوں تک شریعت کے یہ احکام پہنچا دو۔ قلبیہ شہادۃ الغائب فان الشاهد عسی ان یبلغ من ہوا و عی لم منہ،

رَبَّنَا اجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ وَنَجِّنَا

بِرَحْمَتِكَ مِّنَ الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ۝ (٨٧ : ١٠)

رَبَّنَا إِنَّكَ آتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَأَتْ زِينَةً وَقَ

أَمْوَالًا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوا عَن

سَبِيلِكَ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلَى أَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ

عَلَى قُلُوبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوا حَتَّى يَرَوُا الْعَذَابَ

الْأَلِيمَ ۝ (٨٨ : ١٠)

۲۹۵۰۰
۵۲۱۰۰

۶۲۳۳۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ



16 APR 1974

المریان للذین آمنوا، ان تخشع قلوبهم لذكر الله وما نزل

من الحق؛ ولا يكونوا كالذين اوتوا الكتاب من قبل،

فطال عليهم الامد، فقست قلوبهم وكثير منهم فاسقون (۱۶: ۱۵)

کیا مسلمانوں کے لئے اب بھی وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل

اللہ اور اس کے حکموں کے آگے جھک جائیں اور غفلت و نافرمانی سے

باز آئیں؟ اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جن کو مسلمانوں ہی

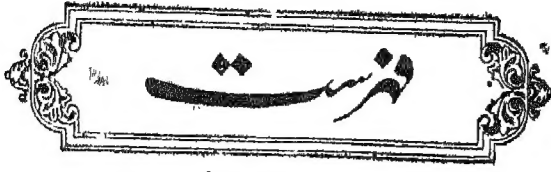
کی طرح کتاب الہی دی گئی تھی (یعنی یہود) لیکن جب ایک بڑی مدت

گزر گئی تو غفلت میں رہتے رہتے ان کے دل سخت ہو گئے۔ احساس

جائناں یا غیرت و حمیت مٹ گئی۔ سچے دلوں کی وہ ترمی اور اثر پذیری

نہ رہی جو صدائے حق سننے ہی چونک اٹھتی ہے۔ فہل من مدکر؟

CHECKED-2000



فصل ترکمان عثمانی اور عالم اسلامی	۱	تمہید -
فصل فریضۂ عظیمۂ دفاع	۵	فصل مسئلہ خلافت -
فصل عہد نبوت کا ایک واقعہ	۹	فصل خلافت خاصہ و خلافت مملوکی
فصل ایک عام غلط فہمی	۱۸	فصل جمع و تفرقہ قوی و مناصب -
فصل احکام قطعیت دفاع	۲۳	فصل اطاعت خلیفہ و التزام جماعت
فصل جزیرہ عرب و بلاد مقدسہ	۳۲	فصل شرائط امامت و خلافت
فصل احکام شرعیہ -	۴۰	فصل نصوص سنۂ و اجماع امت
فصل جزیرہ عرب کی تحدید	۴۷	فصل اذا بریع الخلیفتین فاقتلوا
فصل مسجد اقصیٰ و ارض مقدس		آخر ہما -
فصل خاتمہ سخن و نتائج بحث	۴۷	فصل اجماع امت و جمهور فقہاء اعلام
فصل خلیفۃ المسلمین اور گورنمنٹ برطانیہ	۴۹	فصل سنی اور شیعہ دونوں متفق ہیں
فصل موجودہ و آئندہ حالت اور احکام شرعیہ	۵۰	فصل بعض کتب مشہورہ عقائد و فقہ
فصل ترک مراسلات	۵۲	فصل من حمل علینا السلاح فلیس منا
فصل واقعہ حاطب بن ابی بلتعہ	۵۳	فصل واقعہ امام حسین علیہ السلام
فصل گورنمنٹ کیلئے اصلی سوال	۵۴	فصل شرط قرشیۃ
فصل - راہ عمل	۶۵	فصل دعوت اجماع
فصل - آل اندیا خلافت کمیٹی	۷۰	فصل چند لمحات تاریخچہ
اور فراہمی زراعت	۷۳	فصل خلافت و امامت سلاطین عثمانیہ -
فصل اتباعون اہدکم سبیل الرشاد	۸۱	فصل قرآن متوسطہ و اخیرہ میں مرکزی حکمرانی -

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الحمد لله - رسالہ علی عبادہ الذین اصطفیٰ -

مسئلہ خلافت و بلاد مقدسہ کی نسبت مسلمانوں کے مطالبات کی تمام تر بنیاد احکام شرعیہ پر ہے - اس لیے سب سے مقدم کام یہ تھا کہ ایک مبسوط تحریر اس موضوع پر شائع کی جاتی ، جس میں تمام احکام شرعیہ کی پوری طرح شرح و تحقیق ہوتی ، اور جس قدر شبہات اس بارے میں پیدا ہو سکتے ہیں ، اُن سب کا کما حقہ ازالہ کر دیا جانا -

مسئلہ کے بعض اطراف نہایت نازک ہیں - نظر کی ذرا سی کجی اور بصیرت کی تھوڑی سی کمی بھی طرح طرح کی غلط فہمیوں میں مبتلا کر دے سکتی ہے - چنانچہ یہ رسالہ اسی غرض سے شائع کیا جاتا ہے - ۲۸ - ۲۹ - فروری سنہ ۲۰ کو بنگال خلافت کانفرنس کا اجلاس کلکتہ میں منعقد ہوا - اس اجلاس کیلئے مولانا ابوالکلام نے یہ رسالہ بطور خطبہ صدارت کے صفحہ ۹۱ - تک لکھا تھا - بعد کو بقیہ مباحث بھی انہوں نے بڑھا دیے تاکہ اس موضوع پر ایک مکمل تحریر مرتب ہو جائے - جلسہ میں مولانا نے اپنی عادت کے مطابق محض زبانی تقریر کی تھی ، اور اسی کے ضمن میں احکام و دلائل کا خلاصہ بھی آگیا تھا - چنانچہ تمہید اور خاتمہ کا حصہ دہی ہے جو اُس زبانی تقریر سے قلمبند کیا گیا تھا - البتہ تحریر سے بعض ایسے حصے نکال دیے گئے ، جو مسئلہ کے سیاسی و ملکی پہلو سے تعلق رکھتے تھے - مثلاً ہندو مسلمانوں کا اتحاد ، اور دنیا کا مستقبل عالمگیر امن - تاکہ یہ رسالہ صرف احکام شرعیہ کی بحث و تحقیق کیلئے خاص ہو جائے ، اور اُن مباحث کو علیحدہ رسالوں کی شکل میں شائع کیا جائے -

اس رسالہ کی اشاعت سے تبلیغ و اشاعت کا پہلا کام انجام پا گیا - یعنی مسئلہ پر شرح و بسط کے ساتھ ایک مکمل بحث ہو گئی جس کا خطاب زیادہ تر حضرات علماء سے ہے -

نیز ایک ایسا جامع رسالہ طیار ہو گیا ، جس میں مسئلہ کا تمام ضروری مواد موجود ہے - اب جو ارباب قلم اور کارکنان مجالس خلافت تبلیغ و اشاعت کیلئے مضامین شائع کرنا چاہیں ، وہ اس مراد کو پیش نظر رکھ کر مختلف پیرایوں اور شکلوں میں متعدد رسالے مرتب کر لے سکتے ہیں - ضرورت ہے کہ کثرت کے ساتھ ایسے رسالے جلد شائع کیے جائیں -

(ب)

اب اسکے بعد دلائل و مباحث کا نہیں بلکہ مجرد احکام شرعیہ کی دعوت و تبلیغ کا کام سامنے آتا ہے - یعنی عوام کی آگاہی کیلئے چھوٹے چھوٹے رسالے نہایت آسان اور سہل عبارت میں شائع کیے جائیں - ان میں صرف احکام و فرائض کی توضیح ہو - دلائل و مباحث نہوں -

مسئلہ کے اور متعدد اہم پہلو بھی باقی ہیں - ضروری ہے کہ یہ بھی اسی شرح و بسط کے ساتھ لکھے جائیں -

شعبہ تبلیغ و اشاعت نے اس بارے میں ایک پورا سلسلہ اشاعت و مطبوعات طیار کر لیا ہے - اس سلسلہ کا یہ پہلا نمبر ہے - پریس کی دقتوں کی وجہ سے اسکی اشاعت میں تاخیر ہوگئی - اب لیتھو پریس کا مستقل انتظام ہو گیا ہے - اور انشاء اللہ یکے بعد دیگرے تمام نمبر شائع ہوتے رہیں گے جنکا ہر حصہ مولانا ابوالکلام ہی کے قلم سے نکلا ہے - ہماری کوشش ہوگی کہ ہر ہفتہ اس سلسلہ کا ایک نمبر ضرور شائع ہو جائے -

اس رسالہ کا بھی دوسرا ایڈیشن اضافہ و نظر ثانی کے بعد لیتھو پریس میں زیر طبع ہے -

ان مطبوعات سے مقصود محض تبلیغ و اشاعت ہے - رسالوں کی قیمت جو رکھی گئی ہے، وہ شعبہ اشاعت کی اعانت کیلئے ہے - لیکن تمام علماء و مشائخ کرام اور غیر مستطیع حضرات میں بلا قیمت تقسیم کیے جائیں گے - تمام خلافت کمیٹیوں اور اسلامی انجمنوں کے ناظموں کو چاہیے کہ فوراً اپنے نام اور پتہ سے ہمیں مطلع فرمائیں جو ایک رجسٹر میں درج کرلیے جائیں گے، اور جو نمبر طیار ہوگا، فوراً انکی خدمت میں بھیج دیا جائیگا - شعبہ تبلیغ و اشاعت نے انہی اغراض سے ایک روزانہ اخبار ”زمانہ“ بھی جاری کر دیا ہے -

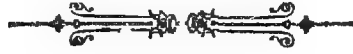
تمام خلافت کمیٹیوں کو چاہیے کہ تبلیغ و اشاعت کے معاملہ میں ہم سے خط و کتابت جاری رکھیں - اس بارے میں ہر طرح کی خدمت و اعانت کیلئے ہم طیار ہیں - خود مولانا ابوالکلام کی سرپرستی و نگرانی اس شعبہ کو حاصل ہے -

محمد اکرم خان

آئیڈیری سکریٹری خلافت کمیٹی بنگال - و شعبہ تبلیغ و اشاعت -

ہرن باڑی لین - کلکتہ،

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ



الحمد لله نعمده و نستعينه و نستغفره و نومن به و نتوكل عليه - و نعوذ بالله من شرور انفسنا و من سيئات اعمالنا - من يهدي الله فلا مضل له - و من يضلله فلا هادي له - و نشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له - و نشهد ان سيدنا محمد عبده و رسوله - صلى الله عليه و على اله و اصحابه و سلم

برادران و بزرگان ملک و ملت !

آپکے صوبے کی یہ پہلی خلافت کانفرنس ہے جسکی صدارت کی عزت مجھے دی گئی ہے - آپکی کمیٹی کے معزز ارکان میں سے ہر رکن یقیناً اس بات سے واقف ہوگا کہ اس قسم کی رئیسانہ اور رسمی حیثیت کا اختیار کرنا میری زندگی میں سب سے پہلا واقعہ ہے ، اور اُس طریق عمل سے مجھے روگردان و منحرف ثابت کرتا ہے جس پر نہایت اصرار کے ساتھ قائم رہنے کی ہمیشہ کوشش کرتا رہا ہوں - سنہ ۱۹۱۱ع میں جبکہ میری موجودہ پبلک زندگی کا بالکل ابتدائی عہد تھا ، مجھے موقع ملا کہ اپنی آئندہ زندگی کیلئے ایک ”مذہب عمل“ قرار دے لوں - خدمت ملک و ملت کے دشت ناپیدا کنار کی طرف قدم اٹھاتے ہوئے اصول عمل کی مختلف راہیں میرے سامنے تھیں ، اور میں چاہتا تھا کہ میرا سفر اُس دانشمند مسافر کی طرح ہو جس نے سفر سے پہلے راہ و منزل کے سارے مرحلوں پر غور کر لیا ہے - اُس طوفانی کشتی کی طرح نہو جس نے ہوا کے جھونکوں اور سمندر کی موجوں پر اپنے سفر کے رخ اور کنارے کی جستجو چھوڑ دی ہو - اسوقت اپنے مذہب عمل کی نسبت جن اصولی مسائل کا میں نے قطعی فیصلہ کر لیا تھا ، اُن میں ایک خاص مسئلہ یہ بھی تھا کہ اپنی زندگی کے ہر حصہ میں ہمیشہ مجالس کی صدارت ، انجمنوں کے عہدوں ، اور اسی طرح کے تمام رئیسانہ اور رسمی منصبوں سے یکقلم کنارہ کش رہوں گا - یہ فیصلہ دراصل میرے ایک بنیادی اور دینی اعتقاد کا قدرتی نتیجہ تھا - میں نے اپنے لیے جو راہ عمل منتخب کی تھی ، وہ دعوت و تبلیغ کی راہ تھی - موجودہ زمانے کی مصطلحہ لیدر شپ کی راہ نہ تھی - میرے سامنے اتباع

و اقتداء کیلئے نوع انسانی کے اُن مخصوص افراد کا نمونہ تھا جو دنیا میں خدا کے رسولوں اور پیغمبروں کے نام سے پسکارے گئے ہیں ، اور جنکے طریق عمل کو اسلام کی اصطلاح میں ” حکمت “ اور ” سنت “ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے ۔ میں اپنی راہ طلبی کا ہاتھ ابراہیم و محمد (علیہما الصلوٰۃ والسلام) کے رهنما ہاتھوں میں دیدینے کیلئے مضطر تھا ۔ گریبالائی ، میزینی ، یا گلید اسٹن اور پارنل بننے کا عشق میرے اندر نہ تھا ۔ پس یہ تو ضروری تھا کہ میرا رجوع کسی گوشہ فقر و نامرادی میں خدمت و محنت کا ایک غیر دلچسپ منظر ہوتا ، یا انسانوں کے کسی ہجوم میں ایک پکارنے والے کی بے پروا پکار ۔ لیکن یہ بالکل ناممکن تھا کہ بیسویں صدی کے فراموش کردہ عہد نبوت و مذاہب کا ایک دلدادہ ، انجمنوں کا عہدہ دار اور مجلسوں کا باقاعدہ پریسیدنٹ ہو ۔ خدا کے رسولوں کا طریق خدمت و دعوت اور بیسویں صدی کے لیڈروں کا طریق ریاست و حکومت ، ایک زندگی میں جمع نہیں ہو سکتے !

حضرات ! مذہب عمل کے اس بنیادی اعتقاد نے میرے لیے قدم قدم پر مشکلات پیدا کر دیں ۔ باوجود کارکن رفیقوں کی موجودگی کے مجھے ہمیشہ اپنی راہ میں صحرا کے درخت کی طرح بے سونس و رفیق اور صرف اپنے سایہ ہی پر قانع رہنا پڑا ۔ یہ مدنیۃ زار عالم جو اپنے ہر گوشہ میں معیٹوں اور رفاقتوں کے راحت افزا جلوؤں سے معمور ہے ، میرے لیے ہمیشہ سمندر رہی یا ایک صحراے ریگ زار ، لیکن کبھی ایک آبادی اور بستی کا اُس نے کام نہیں دیا ، اور نہ کبھی میں اپنے نڈیں اس قابل بنا سکا کہ اسکی رفاقتوں کا ساتھ دے سکوں ۔ تاہم آپ حضرات کیلئے یہ عرض کرنا ضروری نہیں ہے کہ جہاں تک ایک ناچیز انسانی ہستی ارادہ کے ساتھ عمل کو جمع کر سکتی ہے ، میں اپنے اصولوں پر قائم رہنے کیلئے ہمیشہ سخت رہا ہوں ، اور موجودہ زمانے کی لیڈر شب کی دلفریب سے دلفریب نمائشیں اور ابناء عصر کی رفاقت و معیت کی صبر آزما دلچسپیاں بھی کبھی اس بارے میں میرے لیے موثر نہیں ہوئی ہیں ۔ اسی بنا پر جب آپکے لائق اور سرگرم سکرٹری کا تار مجھے بنارس میں ملا اور انہوں نے لکھا کہ کانفرنس کی صدارت تم کو منظور کر لینی چاہیے تو میں نے اداء تشکر امتنان کے بعد اپنے آپکو اس سے معذور ظاہر کیا ۔

لیکن جب میں کلکتہ پہنچا اور اس بارے میں زبانی گفتگو
ی تو کچھ عرصہ کی رد و رکد کے بعد میں نے منظور کر لیا۔ میں
راف کرتا ہوں کہ یہ یقیناً اپنے دستور العمل سے ایک کھلا انحراف ہے
ن آپ یقین کیجیے کہ اس انحراف کیلئے جس چیز نے مجھے مجبور
اُسکی حفاظت بھی میرے لیے تمام اصولوں اور قاعدوں سے زیادہ
زریعہ نہی۔ یعنی اصول کی نہیں بلکہ جس مقصد کیلئے تمام اصول
اُنکی حفاظت۔ اصول مقاصد کیلئے ہیں۔ مقاصد اصول کیلئے
ہیں۔ پس دنیا کے اس سچے اور قدرتی قانون کی بنا پر کہ ہر بڑی
-ز کیلئے چھوٹی چیز کو اور ہمیشہ مقاصد کیلئے وسائل کو قربان
بنا چاہیے، میں طیار ہو گیا کہ مقصد کی راہ میں مقصد کے ایک وسیلے
ی اپنے طریق عمل کو خیر باد کہوں، اور اس مجلس کی صدارت منظور
نے سے انکار نہ کروں۔

حضرات! میں چاہتا ہوں کہ نہایت صفائی کے ساتھ بے پردہ وہ اصلی
ب بھی عرض کروں جس نے مجھے یکایک اپنے طریق عمل کے برخلاف
بات کیلئے آمادہ کر دیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ مجھے نظر بندی کے گوشہ
و عزلت سے نکلے ہوئے بمشکل ابھی پورے دو مہینے ہوئے ہوئے۔ لیکن
تھوڑے عرصے کے اندر ہی میں نے پوری طرح اندازہ کر لیا ہے کہ موجودہ
می و ملکی مسائل کی نسبت کام کرنے والوں کے طریق عمل کا کیا حال
؟ مجھے صاف صاف عرض کر دینا پڑتا ہے کہ ملک کے کار فرما طبقہ کی
س اب سے سات سال پہلے جو رائیں میں نے قائم کی تھیں، اور جنکی وجہ
بسا اوقات نہایت قیمتی اور محبوب رفاقتوں سے بھی مجھے دست بردار
پانا پڑتا تھا، بدقسمتی سے اب تک اُن میں تبدیلی کا رقت نہیں آیا ہے۔
سان مناظر کا کچھ عجیب عالم ہے جسے اپنے چاروں طرف پاتا ہوں۔ ایک طرف
ا کی عام پبلک ہے، اور سورج کی روشنی سے بھی زیادہ یقینی صورت
دیکھ رہا ہوں کہ زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر حالت میں وہ کسی
بیخ راہ عمل پر چل کھڑے ہوئے کیلئے منتظر و مستعد ہے۔ دوسری طرف
کرنے والوں کی جماعت ہے، اور جس جس پہلو سے دیکھتا ہوں، اس پر
ا بھی تذبذب و اضطراب اور تزلزل و انتشار کا عالم طاری نظر آتا ہے جو تمام
ہلے دروں میں طاری رہ چکا ہے۔ اب تک مقاصد سے اعراض ہے اور وسائل
انہماک۔ اب تک حقیقی مصلحت بینی، اور حیلہ جوئی و بہانہ سازی

میں امتیاز کی راہ مسدود ہے اور عزم و یقین کی جگہ ظن و شک اور خف و ہراس کی حکومت قائم ہے - زبانوں کی لکنت گر در ہو چکی ، اور شاید چہروں کا ہراس بھی جاتا رہا لیکن دلوں کی دہشت بدستور باقی ہے اور ایمان کی کمزوری نے اب تک ساتھ نہیں چھوڑا ہے - زبانیں جسقدر تیز ہیں ، قدم میں اتنی تیزی نہیں ہے - اور اعلان جسقدر بلند آہنگی اور وعد آسائی رکھتا ہے ، عمل میں اُسقدر بلند پیمائی نظر نہیں آتی - نیند گو توت چکی اور شاید خفتگان بستر غفلت کر رہیں بھی بدل چکے ، لیکن آنکھوں میں خمار اب تک باقی ہے ؟ اور دھواں بڑھتا جاتا ہے لیکن شعلوں کی چمک کہیں نظر نہیں آتی - اگرچہ خدا کے مقدس نام کی تقدیس سے اب کوئی زبان نا آشنا نہیں رہی لیکن دلوں میں خدا کے ساتھ انسانوں کا در اور نفس کا عشق بھی باقی ہے ، یریدون ان یتخذوا بین ذالک سبیلا (۴ : ۱۴۹) اور اگر حضرت مسیح نے سچ کہا ہے کہ ” ایک نوکر در آقاؤں کو خوش نہیں دے سکتا “ اور اگر قرآن یہ فیصلہ کر دینے میں سچا ہے کہ ما جعل اللہ لرجل من قلبین فی جوفہ (۴ : ۳۳) یعنی

سینے میں کسی شخص کے در دل نہیں ہوتے !

تو یقین کرنا چاہیے کہ ہمارے دلوں کی بستی اب تک سچی خدا پرستی کی عبادت گاہ سے خالی ہے -

حضرات ! مجمع ملامت کرنے میں جلدی نہ کیجئے اگر میں حقیقت کو اس سے بھی زیادہ بے نقاب دیکھنا چاہوں - افسوس کہ وقت کی جلدی اور قانون قدرت کی بے صبری نے ہماری غفلتوں کا ساتھ نہیں دیا - وہ اپنی ازلی بے پروائی کے ساتھ نوائج و عواقب کی آخری منزل تک بڑھتا چلا آیا ہے - اب موت و حیات ، بقاؤ فنا ، ایمان و کفر ، اور خدا اور ماسوی اللہ کی منزل ہمارے سامنے ہے ، اور اسلیے میں قابل ملامت نہیں ہوں اگر حسن بیان اور بلاغت اظہار کے پر پیچ آداب و قواعد کو موت و حیات کی کشمکش میں سنبھال نہیں سکتا - یہ حالات دیکھ کر میں نے ارادہ کر لیا کہ اگر مجھ کو ایک مجلس کے صدر کی حیثیت سے اظہار مطالب کا موقع ملتا ہے تو میں اس سے انکار نہ کروں ، اور اگر صدارت کے حقوق و اختیارات کو اصل مقصد کیلئے استعمال کر سکتا ہوں تو اسکو ایک مفید فرصت تصور کروں - شاید اس طرح اس صحیح راہ عمل کی طرف کوئی قدم

اُتھ سکے جسکو بارہ سال سے اپنے سامنے رکھتا ہوں لیکن رفیقان طریق نے ہمیشہ اس سے اعراض کیا ہے، اور آج بھی جبکہ اُس اعراض کے نثائے سامنے ہیں، تذبذب و اضطراب عمل عزم و ایمان کے استحکام پر غالب نظر آ رہا ہے۔

حضرات! صرف یہی ایک خیال تھا جس نے مجھے اس بات پر آمادہ کر دیا کہ اپنے اپنی محبت اور مہربانی سے جو عزت مجھے دینی چاہی ہے، اُس سے گریز نہ کروں۔ میں آپکا شکر گزار ہوں، اور آپکی دلی رفاقت و اعانت کا طلبگار۔ ہم سب کو اللہ کے فضل و توفیق پر اعتماد ہے جسکے بغیر کائنات ہستی کا کوئی ارادہ اور کوئی عمل کامیابی اور فلاح نہیں پاسکتا۔

امیر جمع ہیں احباب، درد دل کہلے

پھر التفات دل دوستاں رہے نہ رہے!

و ما توفیقی الا باللہ - علیہ توکلت و الیہ انیب -

(مسئلہ خلافت)

حضرات! اب میں اصل مقصد کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ ہم تمام باشندگان ہند کے سامنے کرۂ ارضی کی ایک کثیر آبادی کی طرح اسوقت خلافت اسلامیہ اور مقامات مقدسہ کا مسئلہ درپیش ہے۔ ”خلافت“ عربی کی ایک مصدر ہے۔ اُسکا مادہ ہے ”خلف“۔ اور اسی سے ہے ”خلیفہ“۔ خلیفہ کے لغوی معنی نیابت اور قائم مقامی کے ہیں ”من قوٰلک خلف فلاں فلاناً فی هذا الامر اذا قام مقامہ فیہ بعدہ“ (ابن فارس) یعنی اگر ایک شخص کسی دوسرے شخص کے بعد کسی ایک معاملہ میں یا کسی طاقت و اختیار میں اُسکا نائب و قائم مقام ہوا تو یہ خلافت ہوئی، اور لغۃ میں اسکو خلیفہ یعنی بعد کو آنے والا اور قائم مقام کہینگے۔ خواہ یہ نیابت سابق کی موت و عزل کی وجہ سے ہوئی ہو، یا غیبت کی وجہ سے، یا اپنا اختیار اور منصب سپرد کر دینے کی وجہ سے۔ مفردات امام راغب میں ہے ”الخلافت، النیابة عن الغیر إما بالغیبة المنزب عنہ، و إما لموتہ، و إما لمعجزہ، و إما بالتشريف المستخلف“ (صفحہ ۱۵۵)

یہ لفظ بھی قرآن حکیم کے اختیارات لغویہ میں سے ہے۔ یعنی عربی زبان کے اُن لفظوں میں سے ہے جنکو لغۃ میں عام معانی کیلئے استعمال کیا جاتا تھا مگر قرآن حکیم نے اپنے خاص مصطلحہ شرع معانی کیلئے اختیار کر لیا۔ جیسے ایمان، غیب، تقدیر، بعثت، صلوات وغیر ذلک۔ ایمان کے

لغوي معني يقين و طمانينة اور زوال خوف و شك کے تھے ، لیکن قرآن حکیم نے اسکو ایک خاص طرح کے یقین و اقرار اور عمل کیلئے استعمال کیا ، اور اب ایمان قرآن کی برہی میں عام لغوي معني کے خلاف ایک خاص اصطلاح قرار پاگئی - قرآن کی زبان میں خلافة اور ” استخلاف فی الارض “ اور ” وراثت و تمکن فی الارض “ سے مقصود زمین کی قومی عظمت و ریاست اور قوموں اور ملکوں کی حکومت و سلطنت ہے - قرآن حکیم اسکو سب سے بڑی نعمت قرار دیتا ہے جو اچھے یقین اور اچھے کاموں کے بدلے اقوام عالم کو دنیا میں مل سکتی ہے - قرآن کے نزدیک اس خلافت ارضی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دنیا میں نوع انسانی کی ہدایت و سعادت کیلئے ایک خاص ذمہ دار قوم و حکومت قائم ہو - وہ اللہ کی عدالت کو دنیا میں قائم کرے ، ظلم و جور اور انسان کی ابلیسی ضلالت و طغیان سے اُس کی زمین پاک ہو جائے ، ایک عام امن و سکون اور راحت و طمانينة دنیا میں پھیل جائے ، اور اللہ کا وہ ہمہ گیر قانون عدل جو تمام کائنات ہستی میں سورج سے لیکر زمین کے اندر کے حشرات تک کیلئے نافذ و قائم ہے ، اور جسکو قرآن اپنی زبان میں صراط مستقیم کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے اور جس سے صرف انسان ہی زرگردانی کرنے والا ہے ، زمین کے گوشے گوشے اور چپے چپے میں جاری و ساری ہو کر کرۂ ارضی کو سعادت و امنیت کی ایک بہشت بنادے !

لغة کے اعتبار سے یہ اطلاق اسلئے ہوا کہ سب سے پہلے جو قوم اور قوم کا جو فرد خلیفہ ہوا ، وہ زمین پر اللہ کی عدالت قائم رکھنے میں ، اللہ کی نیابت اور قائم مقامی رکھتا تھا ، اور اس کے بعد والی قوم اپنے سابق کی نائب تھی ، اور ہر خلیفہ سابق کا قائم مقام - ظہور اسلام کے بعد جب ارضی خلافة کے وارث مسلمان ہوئے ، تو اس سلسلہ کا پہلا خلیفہ اللہ صاحب و شارح اسلام تھا - یعنی محمد الرسول اللہ صلعم - اور پھر ان کے بعد جن لوگوں کے ہاتھ اسلام کی مرکزی حکومت آئی ، وہ اس خلیفہ اللہ کے نائب اور قائم مقام ہوئے - اسلئے اُن پر خلیفہ کا اطلاق ہوتا رہا اور اب تک ہو رہا ہے -

یہ زمین کی وراثت و خلافت یکے بعد دیگرے مختلف قوموں کے سپرد ہوتی رہی اور وہ دنیا میں اللہ کی طرف سے دین حق کے خدمت گزار رہے - آیات ذیل میں اسی خلافت کا ذکر ہے :

وہو الذی جعلکم
خلائف الارض (۱۶۵ : ۶)
رہی پروردگار عالم ہے جس نے تم کو زمین
میں خلافت دی -

و یتخذلف ربی قوماً
غیرکم - (۵۷ : ۱۱)
اگر تم نے اپنا فرض ادا نہ کیا تو اللہ تمہاری
جگہ کسی دوسری قوم کو تمہاری جگہ دیدیگا -
پھر ان قوموں کے بعد ہم نے تم کو انکی
جگہ دی تاکہ دیکھیں تمہارے کام کیسے
ہوتے ہیں ؟

و انکرا ان جعلکم خلفاء من
بعد قوم نوح - (۶۸ : ۷)
اور یاد کرو جب تم کو قوم نوح کے بعد انکا
جانشین بنایا -
یا داؤد انا جعلناک
خليفة فی الارض (۲۶ : ۳۸)
اے داؤد ! ہم نے زمین میں تم کو
خلیفہ بنایا -

اسی چیز کو زمین کی وراثت سے بھی تعبیر کیا گیا :

والقد کتبنا فی الزبور
من بعد الذکر ان الارض یرثها
عبادی الصالحون (۱۰۵ : ۲۱)
اور زبور میں بھی ہمارا اعلان یہی تھا کہ
یقیناً زمین کی حکومت ہمارے صالح بندوں
ہی کی وراثت میں آتی ہے -

یہی چیز زمین کی ” تمکین “ اور ” تمکن “ یعنی طاقت و عظمت کا
جماؤ اور قیام بھی ہے جو سر زمین فراعنہ میں کنعان کے ایک اسرائیلی
نرجران نے حاصل کی تھی ، جبکہ وہ غلامی کی حالت میں رہاں فروخت
کیا گیا ، اور پھر اپنے عمل حق و صالح کی قوت سے ایک دن مصر کے
تاج و تخت کا مالک ہو گیا :

کذا لک مکنا لیوسف -
اس طرح ہم نے یوسف کی عظمت مصر
میں قائم کر دی - (۵۶ : ۱۲)

اور اسی کا مسلمانوں سے وعدہ کیا گیا تھا :

الذین ان مکنا ہم فی الارض
انما مرا الصلوة و آتوا الزکوة
و امررا بالمعروف و نہرو
عن المنکر و لہ عاقبة
الامر - (۲۲ : ۴۳)
وہ لوگ کہ اگر ہم انکی طاقت زمین
میں قائم کر دیں تو انکا کام یہ ہوگا کہ نماز
قائم کریں گے ، زکوٰۃ ادا کریں گے ، نیکی کا
حکم دیں گے ، اور برائی سے دنیا کو روکیں گے -

اس آیت کریمہ سے صاف طور پر یہ حقیقت بھی واضح ہوگئی کہ تمکین فی الارض یا حکومت کا مقصد اصلی قرآن حکیم کے نزدیک کیا ہے ؟ معلوم ہوگیا کہ صرف یہ ہے کہ اللہ کی عبادت دنیا میں قائم کی جائے ، نیکی اور راستی کا اعلان و ظہور ہو ، برائی سے نوع انسانی کے دلوں اور ہاتھوں کو روک دیا جائے !

دوسری آیت میں اسکو خلافت کے لفظ سے تعبیر کیا :

وعد اللہ الذین آمنوا
مذکر و عملوا الصالحات
لیستخلفنہم فی الارض کما
استخلف الذین من قبلہم
ولیمکنن لہم دینہم الذی
ارتضی لہم ، ولیدللنہم
من بعد خوفہم امناً -
یعدونذی لا یشرکون بی شیئاً
ومن کفر بعد ذلک فارلاک
ہم الفاسقون (۲۴ : ۵۵)

یہ آیت اسوقت نازل ہوئی جب ہجرت کے بعد مدینہ میں مسلمانوں کی زندگی چاروں طرف دشمنوں سے گھری ہوئی تھی اور قلت تعداد و بے سر سامانی حال کے ساتھ دشمنوں کے پے درپے حملوں کا یہ حال تھا کہ کسی وقت بھی ہتھیار اپنے جسم سے دور نہیں کرسکتے تھے - اسوقت بعض مسلمانوں کی زبان سے بے اختیار یہ جملہ نکل گیا ” ما یاتی علینا یوم نأمن فیہ و نضع عننا السلاح “ ایک دن بھی ہم پر ایسا نہیں آیا کہ امن و بے خوفی کے سانہ صبح شام بسر کرتے اور ہتھیار اپنے جسم سے الگ کرسکتے - ابو العالیہ راری ہیں کہ اسپر مندرجہ صدر آیت نازل ہوئی اور اللہ نے مسلمانوں کو بشارت دی کہ ایمان و عمل صالح کا پھل عنقریب ملنے والا ہے جبکہ خوف کی جگہ امن ہوگا ، مظلومی و بیچارگی کی جگہ قیام و فرمانبرائی ہوگی ، اور سب سے بڑھکر یہ کہ زمین کی خلافت انہی کے قبضہ اقتدار میں آجائیگی - (تفسیر طبری جلد ۱۸ صفحہ ۱۲۲)

اس آیت سے ضمناً یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ قرآن حکیم کے نزدیک جو چیز ” خلافت “ ہے وہ خلافت فی الارض ہے - یعنی زمین کی حکومت

و تسلط - پس اسلام کا خلیفہ ہونہیں سکتا جب تک اس آیت کے بموجب زمین پر کامل حکومت و اختیار آئے حاصل نہ ہو - وہ سبوحیت کے پوپ کی طرح محض ایک آسمانی و دینی اقتدار نہیں ہے جس کے لیے دلوں کا اعتقاد اور پیشانیوں کا سجدہ کافی ہو - وہ کامل معذوں میں سلطنت و فرمانرانی ہے - اسلام کے قانون میں دینی و روحانی اقتدار خدا و رسول کے سوا کوئی انسانی رجحون نہیں رکھتا - ایسے اقتدار کو قرآن نے شرک قرار دیا ہے - اسکا مثنا اس کے ظہور کا پہلا کام تھا : اتخذوا احبارہم و رہبانہم ارباباً من دن اللہ - (۹ : ۳۲) اور ما کان لبشر ان یرتبه اللہ الکتاب و الحکم و النبوة ، ثم یقول للناس کنوا عباداً لی من دن اللہ ، و لکن کنوا ربانیین بما کنتم تعلمون الکتاب و بما کنتم تدرسون - (۲ : ۷۹)

اللہ کے تمام وعدوں کی طرح یہ وعدہ بھی پورا ہوا - آتھہ نو سال بعد جب داعی اسلام دنیا سے تشریف لیگئے تو تمام جزیرہ عرب مسلمانوں کے قبضہ میں آچکا تھا اور رومیوں کے مقابلہ کیلئے اسلامی فوجیں مدینہ سے نکل رہی تھیں - اس سلسلہ خلافت اسلامیہ کا پہلا خلیفہ اللہ خرد حضرت داعی اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کا وجود مقدس تھا ، اور آپ نے اپنے بعد کے جانشینوں کو خرد لفظ خلفاء سے تعبیر فرما کر واضح کر دیا تھا کہ وہ آپ کے نائب اور قائم مقام ہونگے - ” علیکم بسنتی و سنتہ خلفاء الراشدین “ (ابن ماجہ عن العرباض بن ساریہ) و امثالہا - آپ کے بعد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ جب جانشین ہوئے تو وہ خلیفہ رسول اللہ تھے -

(خلافت خاصہ و خلافت ملوکہ)

آنحضرت کے بعد خلافت اپنے خصائص و نتائج کے اعتبار سے دو حصے سلسلوں میں منقسم ہو گئی - خرد آنحضرت نے نہ صرف ان دو سلسلوں کی پیشتر سے خبر ہی دیدی تھی ، بلکہ ان کے تمام علائم و خصائص صاف صاف بیان کر دیے تھے اس بارے میں جراحادیت موجود ہیں ، وہ کثرت طرق و شہرت متن و قبول طبقات کی بنا پر حد تو اتار تک پہنچ چکی ہیں - پہلا سلسلہ خلافت خلفاء راشدین مہدیین کا تھا جنکی خلافت منہاج نبوت پر تھی - وہ صحیح و کامل معذوں میں منصب نبوت کے جانشین اور جامعۃ شخص رسالہ کے قائم مقام تھے - یعنی انکا طریق کار تھیک تھیک طریق نبوت کے مطابق تھا اور اسلیئے گویا عہد نبوت کا ایک آخری جزء - اور جس طرح چھوڑ

نبوة میں مختلف حیثیتوں کا اجتماع تھا ، اسی طرح انکی شخصیت بھی جامع و حاربی تھی - دینی دعوت اور شرعی اجتہاد و امر ، حکومت و فرمانروائی اور قرام و نظام شرع ، نظام شریعت اور نظام سیاست ، یہ سب انکی ذات میں اکٹھے تھے - انکی حکومت سچے اور حقیقی اسلامی نظام پر تھی - یعنی حکومت شوری ، جسکو آجکل کی زبان میں ایک ناقص تشبیہ کے ساتھ ہی پہلک کہہ سکتے ہیں - یہ سلسلہ حضرت علی علیہ السلام پر ختم ہو گیا -

دوسرا سلسلہ خلافت منہاج نبوت سے الگ مجرد حکومت و پادشاہت کا تھا ، جبکہ عجمی بدعتیں خالص اسلامی و عربی تمدن سے ملکر ایک نیا دور شروع کر رہی تھیں - یہ سلسلہ خلافت اگرچہ بعد کی خلافتوں کے مقابلے میں پہلے سلسلے سے اقرب تھا ، لیکن خلافت راشدہ کے حقیقی خصائص ناپید ہو گئے تھے - خلفاء بذراعت سے لیکر آج تک جو سلسلہ خلافت اسلامیہ جاری ہے ، وہ اسی دوسری قسم میں داخل ہے - احادیث میں پہلے سلسلہ کو بوجہ غلبہ طریقی ہدایت و نبوة خلافت کے لفظ سے اور دوسرے کو بوجہ غلبہ سیاست و شخصیت پادشاہت کے لفظ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے ” الخلافة بعدی ثلاثوں عاماً ثم ملک بعد ذلک “ اور حدیث ابو ہریرہ ” الخلافة بالمدينة و الملك بالشام “ ایک دوسری حدیث میں بالترتیب تین دور بتلائے گئے ہیں ” نبوة و رحمة “ ثم خلافة و رحمة “ و فی لفظ ” خلافة علی منہاج النبوة ثم یكون ملک عضوض “ اور معاریہ نے اس کی نسبت کہا تھا - ہم نے عہد ملوکی پر قناعت کر لی -

آخری حدیث کے مطابق تین دور ہوئے - عہد نبوت و رحمت ، خلافت و رحمت ، پادشاہی و استبدادی فرمانروائی - پہلا دور آنحضرت معلوم کی وفات پر ختم ہو گیا - دوسرا دور فی الحقیقت عہد نبوت کا ایک تلمہ اور لازمی جزء تھا (جیسا کہ سلسلہ دعوت و ظہور نبوت اور تکمیل کاروبار شرائع میں ہمیشہ سنۃ اللہ رہی ہے) جو حضرت امیر علیہ السلام پر ختم ہو گیا - اس کے بعد سے مجرد عہد پادشاہی و استبدادی شروع ہوا جو آج تک جاری ہے - اس دور کی بھی بہت سی مختلف شاخیں علحدہ علحدہ احادیث میں بتلائی گئی تھیں ، اور وہ سب تھیک تھیک ظہور میں آئیں - نبوت و رحمت کی برکات کی معرور و وفقدان کا ایک تدریجی تذبذب تھا ، اور بدعات و فتن کے ظہور و احاطہ کی ایک تدریجی ترقی تھی ،

کالخصیر عوداً عوداً ' جو حضرت عثمان کی شہادت سے شروع ہوئی ' اور جسقدر عہد نبوت سے درمی بڑھتی گئی ' اتنی ہی عہد نبوت اور خلافت رحمہ کی سعادتوں سے امت محروم ہوتی گئی - یہ محرومی صرف امامت و خلافت کبریٰ کے معاملہ ہی میں نہیں ہوئی ' بلکہ قوام امت کی اونچی اور اصولی باتوں سے لیکر حیات شخصی و انفرادی کی اعتقادی و عملی جزئیات تک ' ساری باتوں کا یہی حال ہوا - فتنہ و فساد کے اس سیلاب کو صرف ایک دیوار روکے ہوئے تھے جو بقول حضرت حذیفہ (اعلم الصحابة بالفتن) حضرت عمر (رض) کا رجوت تھا - جونہی یہ بنیان مرموص ہتی ' وہ سیلاب عظیم اُمنڈا ' اور پھر کوئی سد و بند اُسکی راہ نہ روک سکا - اسی سیلاب کو حضرت حذیفہ کی رابست میں " التي تخرج كموج البحر " سے تعبیر کیا گیا تھا - یعنی سمندر کی موجوں کی طرح اُسکی موجیں اُٹھینگی - سو واقعی اُٹھیں ' اور درر خلافت و رحمت اور " خلافة علی منہاج النبوة " کی عظیم اُشان عمارت اسے طلاطم و طغیان میں اُنا فنا بہ گئی -

احادیث میں نہایت کثرت کے ساتھ اسلام کے ایک آخری درمی بھی خبر دی گئی ہے جو اپنے برکات کے اعتبار سے درارل کے خصائص تازہ کردیگا ' اور جسکا حال یہ ہوگا کہ " لا یدری ازلہا خیرام آخرہا " نہیں کہا جاسکتا کہ امت کی ابتدا زیادہ کامیاب تھی یا اُسکا اختتام ؟ یہی وہ آخری زمانہ ہوگا جب اللہ کا اعلان اپنے کامل معنوں میں پورا ہوکر رہیگا کہ :

لیظہر علی الدین کلمہ دین اسلام اور اُسکا رسول اسلیے آیا تاکہ تمام رلوکرہ المشرکون (۹:۶۱) دینوں اور قوموں پر بالآخر غالب ہوکر رہے (کیونکہ آخری غلبہ صرف اصلح کیلیے ہے)

تمام دینوں میں اصلح صرف اسلام ہی ہے)
یہی وجہ ہے کہ مایوسیوں اور نامرادیوں کی اس عالمگیر تاریکی میں بھی جو آج چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے ' ایک مومن قلب کیلیے فتح و اقبال کی روشنیاں برابر چمک رہی ہیں - بلکہ جسقدر تاریکی بڑھتی جاتی ہے ' اُنڈا ہی زیادہ طلوع صبح کا رقت قریب آتا جاتا ہے : الا ان نصر اللہ ہی قریب !

تفاوت ست میان شنیدن من و تو
تو بستن درو من فتح باب می شلم !

(عہد اجتماع وائتلاف ، ردور اشتات و انتشار)

آب آزرہ خاطر نہیں اگر موضوع کی وسعت چند لمحوں کیلئے مجمع اپنے اطراف و جوانب کی طرف بے اختیار مائل کر لے - اس مقام کی مزید وضاحت کیلئے بہتر ہوگا کہ در خاص اصطلاحی لفظوں کے معانی پر آپ پہلے غور کر لیں - ایک ”اجتماع“ اور ”ائتلاف“ ہے - دوسرا ”اشتات“ اور ”انتشار“ ہے - نہ صرف امت اسلامیہ بلکہ تمام اقوام و اہم عالم کی موت و حیات، ترقی و تنزل، اور سعادت و شقاوت کے جو اصولی اسباب و مراتب قرآن حکیم نے بیان کیے ہیں، انکی سب سے زیادہ اہم حقیقت انہی الفاظ کے اندر پوشیدہ ہے - ”اجتماع“ کے معنی ہیں ”ضم الشيء بقربب بعضه من بعض“ (مفردات امام راغب: ۹۵) یعنی مختلف چیزوں کا باہم اکٹھا ہو جانا - اور ائتلاف ”الف“ سے ہے - اس کے معنی ہیں ”ما جمع من اجزاء مختلفة“ و رتب ترتیباً، قدم فیہ ما حقہ ان یقدم، و اخر فیہ ما حقہ ان یؤخر“ (مفردات: ۱۹) یعنی مختلف چیزوں کا اس تناسب اور ترتیب کے ساتھ اکٹھا ہو جانا کہ جس چیز کو جس جگہ ہونا چاہیے وہی جگہ آئے ملے - جو پہلے ہونے کی حقدار ہے وہ پہلے رہے - جسکو آخری جگہ ملنی چاہیے، وہ آخری جگہ پائے - ”عہد اجتماع وائتلاف“ سے مقصود وہ حالت ہے جب مختلف کارکن قوتیں کسی ایک مقام، ایک مرکز، ایک سلسلے، ایک رجوع، ایک طاقت، اور ایک فرد واحد میں اپنی قدرتی اور مناسب ترکیب و ترتیب کے ساتھ اکٹھی ہو جاتی ہیں، اور تمام مواد، قوی، اعمال، اور افراد پر ایک اجتماعی و انضمامی دور طاری ہو جاتا ہے - بعدیکہ ہر قوت اکٹھی ہر عمل با ہمدگر جزا اور ملا ہوا، ہر چیز بندھی اور سمٹی ہوئی، ہر فرد زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے متصل ہوتا ہے - کسی چیز، کسی گوشے، کسی عمل میں علیحدگی، جدائی، انتشار، اور الگ الگ، جزء جزء، فرد فرد، ہو کر رہنے والی حالت نہیں ہوتی - مادہ میں جب یہ اجتماع و انضمام پیدا ہو جاتا ہے، تو اسی سے تخلیق و تکوین اور رجوع و رہستی کے تمام مراتب ظہور میں آتے ہیں - اسی کو قرآن حکیم نے اپنی اصطلاح میں مرتبہ ”تخلیق“ و ”تسویہ“ سے بھی تعبیر کیا ہے: الذی خلق فسوی (۸۶: ۲) پس زندگی اور رجوع نہیں ہے مگر اجتماع وائتلاف، اور موت و فنا نہیں ہے مگر اسکا ضد - یہی حالت جب افعال و اعمال پر طاری ہوتی ہے تو اخلاق کی زبان میں اسکو ”خیر“ اور شریعة

کی زبان میں ”عمل صالح“ اور ”حسنات“ کہتے ہیں۔ جب جسم انسانی پر طاری ہوتی ہے تو طب کی اصطلاح میں ”تندرستی“ سے تعبیر کی جاتی ہے اور حکیم کہتا ہے کہ یہ ”زندگی“ ہے۔ اور پھر یہی حالت ہے کہ جب قومی و ملی زندگی کی قوتوں اور عملوں پر طاری ہو جاتی ہے تو اسکا نام ”حیات قومی و اجتماعی“ ہوتا ہے، اور اسکا ظہور قومی اقبال و ترقی اور نفوذ و تسلط کی شکل میں دنیا دیکھتی ہے۔ الفاظ بہت سے ہیں مگر معنی ایک ہے۔ مظاہر گو مختلف ہیں مگر تمام کارخانہ کاڈنات میں اس حکیم یگانہ و واحد کی ذات کی طرح، اسکا قانون حیات و وجود بھی ایک ہی ہے :

عبارة تنا شتی و حسنک واحد
رکل الی ذاک الجمال یشیر !

اس حالت کا ضد ”اشتات و انتشار“ ہے۔ ”اشتات“ ”شتت“ سے ہے جسکے معنی لغۃ میں ”تفریق“ اور الگ الگ ہو جانے کے ہیں۔ ”یقال شت جمعہم شتا و شتاتاً“ و جاؤا اشتاتاً۔ ای متفرقی النظام“ (مفردات : ۲۵۶) قرآن حکیم میں ہے : یومئذ یصدر الناس اُشتاتاً (۶:۹۹) اور من نبات شتی (۵۳:۲۰) اور رقلونہم شتی (۱۴:۵۹) ”ای مختلفہ۔ انتشار“ ”نشر“ سے ہے۔ اسکے معنی بھی الگ الگ ہو جانے کے ہیں۔ یعنی تفرق کے۔ سورہ جمعہ میں ہے : فاذا قضیت الصلوة فاننشروا۔ یعنی تفرقوا۔ ”اشتات و انتشار“ سے مقصود یہ حالت ہے جب اجتماع و الائلاف کے برعکس ہر بات میں الگ الگ ہو جانے، متفرق اور پراگندہ ہونے، اور باہم دگر علیحدگی و بیگانگی کی حالت طاری ہو جائے۔ مراد میں، قوی میں، اعمال میں، افراد میں، ہر بات میں پہلی حالت سے ضد اور عکس کی حالت پیدا ہو جائے۔ یہ حالت جب مادہ پر طاری ہوتی ہے تو ”تکوین“ کی جگہ ”فساد“ اور ”وجود“ کی جگہ ”عدم و فنا“ کا اسپر اطلاق ہوتا ہے۔ جسم پر طاری ہوتی ہے تو اسکا نام پہلے ”بیماری“ اور پھر ”موت“ ہے۔ اعمال پر طاری ہوتی ہے تو اسی کو قرآن حکیم اپنی اصطلاح میں ”عمل سر“ اور ”عصیان“ سے تعبیر کرتا ہے۔ اور پھر یہی چیز ہے کہ جب قوموں اور امتوں کی اجتماعی زندگی پر طاری ہو جاتی ہے تو دنیا دیکھتی ہے کہ اقبال کی جگہ ادبار، عروج کی جگہ تسفل، ترقی کی جگہ تنزل، عظمت کی جگہ ذلت، حکومت کی جگہ محکومیت، اور بالآخر زندگی کی جگہ موت اس پر چھا گئی ہے !

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے جابجا ”اجتماع و ائتلاف“ کو قومی زندگی کی سب سے بڑی بنیاد، اور اسلیے انسان کیلیے اللہ کی جانب سے سب سے بڑی رحمت و نعمت قرار دیا ہے، اور اسکو ”اعتصام بحبل اللہ“ اور اسی طرح کی تعبیرات عظیمہ سے موسوم کیا ہے۔ مسلمانوں کے اولین مادہ تکوین امت یعنی اہل عرب کو مخاطب کر کے اور پھر تمام عرب و عجم سے فرمایا :

واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً
ولا تفرقوا! واذکروا
نعمت اللہ علیکم ان کنتم
اعداء فالفا بیدن قلبکم
فاصبحکم بنعمۃ اخوانا -
اللہ کے اس احسان و رحمت کو نہ بھولو
کہ کیسی عظیم الشان نعمت ہے جس سے
تم سرفراز کیے گئے؟ تمہارا حال یہ تھا کہ بالکل
(۲ : ۱۰۳)

بکھرے ہوئے اور ایک دوسرے سے توتے ہوئے تھے۔ باہمدگر دشمن و مخالف۔ لیکن اللہ نے اپنے رسول اور انہی تعلیم حق کے ذریعہ تم سب کو باہم ملا دیا اور اکٹھا کر دیا۔ پہلے ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اب بھائی بھائی ہو گئے!

اسکے بعد فرمایا کہ اشتات و انتشار کی زندگی کو بقاؤ قیام نہیں ہو سکتا۔ وہ ہلاکی کی ایک آگ ہے جسکے دھکتے ہوئے شعلوں کے اوپر کبھی قومی زندگی نشو و نما نہیں پاسکتی :

وکنتم علی شفا حفرة من النار
فانقذکم منها - کذاک یبیین
اللہ لکم آیاتہ لعلکم تتقون -
اور تمہارا یہ حال تھا کہ آگ کے دھکتے
ہوئے گڑھے کے کنارے کھڑے تھے، پر اللہ
نے تمہیں بچا لیا۔ اللہ تعالیٰ اپنے
فضل و رحمت کی نشانیاں اسی طرح
(۲ : ۱۰۳)

تم پر کھولتا ہے تاکہ تم کامیابی کی راہ پاو!

یہ بھی جابجا بتلادیا کہ قوموں اور ملکوں میں اس اجتماع و ائتلاف کی صالح و حقیقی زندگی کا پیدا کر دینا محض انسانی و ارضی تدبیر و سعی سے ممکن نہیں۔ دنیا میں کوئی انسانی تدبیر امت نہیں پیدا کر سکتی۔ یہ بات صرف اللہ ہی کی توفیق و رحمت اور اُسکی رحیمی و تزیل کی آسمانی طاقت پر موقوف ہے کہ بکھرے ہوئے ٹکروں کو جوڑ کر ایک ہذا دے :

لر انفقتم ما فی الارض اگر تم زمین کا سارا خزانہ بھی خرچ کر ڈالے
 جمیعاً، ما الفت بین جب بھی ان بکھرے ہوئے اور اختلاف و تفریق
 قلوبہم - ولكن الله الف میں ڈوبے ہوئے دلوں کو محبت و اتحاد
 بینہم - انه عزیز حکیم کے ساتھ جوڑ نہیں سکتے تھے - یہ اللہ ہی کا
 فضل ہے جس نے متفرق دلوں کو اکٹھا کر دیا - (۶۸ : ۸)

اور اسی لیے قرآن حکیم ظہور شریعت و نزول وحی کا پہلا نتیجہ اجتماع
 والذلاف قرار دیتا ہے، اور بار بار کہتا ہے کہ تفرقة و انتشار شریعت و اسلام کے
 کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتے - اور اس لیے یہ نتیجہ شریعت سے بغی و عدوان
 اور اسکو بالکل ترک کردینے کا ہے : فما اختلفوا حتی جاءہم العلم (۱۳ : ۹۳)
و آتیناہم بینات من الامر فما اختلفوا الا من بعد ما جاءہم العلم بغیا بینہم
 (۱۶ : ۴۵) ولا تکتوبوا کالذین تفرقوا من بعد ما جاءہم البینات (۲ : ۱۰۴)

اور اسی بنا پر شارع نے اسلام اور اسلامی زندگی کا دوسرا نام ”جماعت“
 رکھا ہے، اور جماعت سے علاحدگی کو ”جاهلیہ“ اور ”حیاء جاہلی“ سے
 تعبیر کیا ہے، جیسا کہ آگے بالتفصیل آئیگا : ”من فارق الجماعة“ فمات
 فمیئۃ جاہلیہ“ وغیر ذلک، اور اسی بنا پر کثرت کے ساتھ وہ احادیث و آثار
 موجود ہیں جن میں نہایت شدت کے ساتھ ہر مسلمان کو ہر حال میں
 التزام جماعت اور اطاعت امیر کا حکم دیا گیا، اگرچہ وہ غیر مستحق ہو،
 نا اہل ہو، فاسق ہو، ظالم ہو، کرٹی ہو، بشرطیکہ مسلمان ہو اور نماز قائم رکھے
 (ما اقاموا الصلوۃ) اور ساتھ ہی بتلادیا گیا کہ جس شخص نے جماعت سے
 علاحدگی کی راہ اختیار کی تو اُس نے اپنے تئیں شیطان کے حوالے کر دیا -
 یعنی گمراہی اور گمراہی کے لیے ضروری ہے - زنجیر کا توڑنا مشکل ہے، لیکن
 کوئی کڑی زنجیر سے الگ ہوگئی ہو تو ایک چھوٹا سا حلقہ ہے جسکو
 انگوٹھے سے مسل دیا جاسکتا ہے - بندھے ہوئے جہاز کو کون زور آور ہے جو ایک زور
 میں دو کر دے ؟ لیکن اسی کی الگ الگ سینک کو تکتے تکتے کر دیتے
 کیلئے طفل شیر خوار کی آنکلیاں بھی پروری طرح مضبوط ہیں -
 حضرة عمر اپنے خطبوں میں بار بار آنحضرتہ صلعم سے روایت کرتے ”علیکم
 بالجماعۃ فان الشیطان مع الفذۃ و هو من الالثنین ابعء“ دوسری روایت
 میں ہے ”فان الشیطان مع الواحد“ یعنی جماعت سے الگ نہ ہو - ہمیشہ
 جماعت بنکر رہو - کیونکہ جب کوئی تنہا اور الگ ہوا تو شیطان اسکا ساتھی
 ہے - در انسان بھی ملکر رہیں تو شیطان اُسے دور ہے - اعتدائی

و جماعتی قوت ان میں پیدا ہو گئی - اب انپر شیطان کا داؤ نہیں چل سکتا - یہ الفاظ مشہور خطبہ جابیہ کے ہیں جو عبد اللہ بن دینار، عاصم بن سعد، سلیمان بن یسار، وغیرہم سے مرزی ہے، اور بیہقی نے امام شافعی کے طریق سے نقل کیا کہ انہوں نے اجماع کے اثبات میں اسی روایت کو پیش کیا تھا - اسی طرح حدیث متواتر بالمعنی ”علیکم بالسواد الاعظم“ اور ”فانہ من شد شد فی الذار“ اور ”ید اللہ علی الجماعہ“ اور ”لا یجمع اللہ امتی علی الضلالہ“ (ارکما قال) اور خطبہ حضرت امیر کے ”وایاکم و الفرتة“ فان الشاذ من الناس للشیطان، کما ان الشاذ من الغنم للذئب - الا، من دعا الی هذا الشعار فاقتلوه و لولان تحت عامتی هذا“ وغیر ذلک اس بارے میں معلوم و مشہور ہیں - آخری قول دیگر روایات میں بطریق مرفوع بھی منقول ہے -

اسی طرح نماز کی جماعت کی نسبت ہر حال میں التزام پر زور دینا، اور اگرچہ امام نا اہل ہو لیکن سعی قیام اہل کے ساتھ التزام جماعت کو بھی جاری رکھنا، حتیٰ کہ ”ملوا خلف کل ہر فاجر“ تو اسمیں بھی حقیقت مضمر ہے کہ زندگی جماعتی زندگی ہے - انفرادی فرقہ ہر حال میں بربادی و ہلاکت ہے - پس جماعت سے کسی حال میں باہر نہ ہونا چاہیے، اور نہ بجز کفر ظاہر و صریح کے امام کی اطاعت سے منحرف ہونا چاہیے - یہی وجہ ہے کہ اراکل عہد بنو امیہ میں جبکہ صحابہ کرام کی جماعت ہر ناحیہ ملک میں موجود تھی، تمام صحابہ نے اس پر اجماع کیا کہ گواہی بنو امیہ خلافت کے اہل نہیں، طریقی ہدی و سنت سے منحرف ہو گئے، نظام شوری درہم برہم ہو گیا، بدعت و احداث اور صریح ظلم و جور انکا شیوہ ہے - با ایں ہمہ انپر خرچ جائز نہیں - انہی کی اطاعت کرنی چاہیے - انہی کے پیچھے نماز پڑھنی چاہیے - انہی کو زکوٰۃ دینی چاہیے - حفظ ملک و ملت کی راہ میں نکلیں تو انہی کے جھنڈے کے نیچے سمع و طاعة کے ساتھ جمع ہو جانا چاہیے - کما سیاتی تفصیلہ عنقریب -

اور یہی سبب ہے کہ سورہ فاتحہ میں جو قومی دعا ہر مومن قلب و لسان کو سکھلائی گئی، اس میں متکلم واحد نہیں قرار دیا گیا بلکہ جمع، حالانکہ وہ دعا فرداً فرداً ہر مومن کی زبان سے نکلنے والی تھی : اهدنا الصراط المستقیم - فرمایا - ”اھدنی“ نہیں کہا گیا - یہ اسلئے ہے کہ قرآن کے نزدیک فرد اور فرد کی ہستی کوئی شے نہیں ہے - ہستی صرف اجتماع اور جماعت

گئی ہے، اور فرد کا وجود اور اعمال بھی صرف اسی لیے ہیں تاکہ انکے اجتماع و تالیف سے ہئیت اجتماعیہ پیدا ہو۔ اسی لیے اس دعا میں کہ حاصل ایمان، و خلاصۃ قرآن، و عصارۃ اسلام ہے، ضمیر متکلم جمع آئی، نہ کہ واحد۔ اور اسی لیے مسلمانوں کی باہمی ملاقات کے وقت جو امتیازی دعا قرار دی گئی، وہ بھی بصیغۃ جمع آئی اگرچہ مخاطب واحد ہو۔ یعنی ”السلام علیکم“۔ ”السلام علیک“ نہیں قرار دیا گیا۔ اسی طرح نماز سے باہر آنے کیلئے بھی ”السلام علیکم“ بصیغۃ جمع رکھا گیا۔ واحد کا صیغہ استعمال نہیں کیا گیا۔

اور اسی بنا پر شریعت نے نہ صرف قومی زندگی کیلئے جماعت کی پابندی بنیاد حیات قرار دی، بلکہ احکام و اعمال کے ہر گوشے اور ہر شاخ میں بھی یہی اجتماعی و اثنافی حیثیت بطور اصل و اساس کے رکھی گئی۔ نماز کی جماعت خمسہ اور جمعہ و عیدین کا حال ظاہر ہے۔ حج بجز اجتماع کے آرزو کچھ نہیں۔ زکوٰۃ کی بنیاد ہی اجتماعی زندگی کا قیام اور ہر فرد کے مال و اندوختہ میں جماعت کا ایک حصہ قرار دیدینا ہے۔ علامہ بریل آسکی ادائیگی کا نظام بھی انفرادی حیثیت سے نہیں رکھا گیا بلکہ جماعتی حیثیت سے۔ یعنی ہر فرد کو اپنی زکوٰۃ خود خرچ کر دینے کا اختیار نہیں دیا گیا جیسا کہ بدقسمتی سے آج مسلمان کر رہے ہیں اور جو صریح غیر شرعی طریقہ ہے، بلکہ مصارف زکوٰۃ متعین کر کے حکم دیا گیا کہ ہر شخص اپنی زکوٰۃ کی رقم امام و خلیفۃ وقت کے سپرد کر دے۔ پس اسکے خرچ کی بھی اصلی صورت جماعتی ہے نہ کہ انفرادی۔ یہ امام کا کام ہے کہ اسکا مصرف تجویز کرے اور مصارف منصوبہ میں سے جس کام میں زیادہ ضرورت دیکھے خرچ کرے۔ ہندوستان میں اگر امام کا وجود نہ تھا، تو جس طرح جمعہ و عیدین وغیرہ کا انتظام ہذا کی بنا پر کیا گیا، زکوٰۃ کا بھی کرنا تھا۔

اور پھر یہ حقیقت، سقندر راضح ہو جاتی ہے جب ان تمام مشہور احادیث پر غور کیا جائے جن میں مسلمانوں کی متحدہ قومیت کی تصریح کھینچی گئی ہے: ”مثل المؤمنین فی تواضع و تراحمهم و تعاطفهم کمثل الجسد الواحد۔ اذا اشتكى منه عضو، تداعی له سائر الجسد بالسهر و الحمی“ اور ”المسلم المسلم المؤمن عضو من جسد واحد“۔ یعنی مسلمانوں کی قومیت ایسی ہے جیسے ایک جسم اور اسکے مختلف اعضا۔ ایک عضو میں درد ہو تو سارا جسم محسوس کرتا ہے، اسی طرح بے چینگی اور تکلیف میں

اس طرح حصہ لیتا ہے جیسے خود اسکے اندر درد آٹھ رہا ہو۔ اور انکی مثال دیوار کی سی ہے۔ ہر اینٹ دوسری اینٹ سے سہارا پاتی اور سہارا دیتی ہے۔ پھر تشبیہک اصابع کر کے اسکی تصویر بتلا دی۔ یعنی ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں رکھ کر دکھلا دیا کہ اس طرح ایک دوسرے سے جڑا ہوا اور متصل ہے۔ سو ان تمام تصریحات میں بھی اسی حقیقت کو راضع کیا ہے کہ اسلام کی قومیت متفرق اینٹوں کا نام نہیں ہے۔ دیوار کا نام ہے۔ الگ الگ اینٹ کا کوئی مستقل وجود نہیں۔ ہے تو اجتماعی وجود ہے۔ یعنی دیوار کا ایک جزء ہے، اور انہی اجزاء کے ملنے سے دیوار متشکل ہوتی ہے۔

اور یاد رہے کہ یہ جو نماز میں تسبیۃ صفوف پر سخت زور دیا گیا۔ یعنی صف بندی پر، اور سب کے سرور، سینوں، پانوں کے ایک سیدھے میں ہونے پر۔ ”لنسون صفوکم اریکھا لسن اللہ بین وجوہکم“ (بخاری) اور روایت انس کہ ”سروا صفوکم فان تسبیۃ الصفوف من اقامۃ الصلوۃ“ (بخاری) و فی لفظ ”من تمام الصلوۃ“ تو اسمیں بھی یہی بھید ہے اور تشریح کا یہ موقع نہیں۔ قرآن و سنت کی تصریحات و حکمیات اس بارے میں اسقدر کثرت سے اور محتاج تفسیر و کشف ہیں کہ ایک ضخیم مجلد مطلوب۔ تفسیر البیان میں مفصل لکھ چکا ہوں۔

(جمع و تفرقہ قوی و مناصب)

حضرات ! اس قانون الہی کے مطابق مسلمانوں کی قومی زندگی و عروج کا اصلی دور رہی تھا، جب انکی قومی و انفرادی، مادی و معنوی، اعتقادی و عملی زندگی پر اجتماع و ائتلاف کی رحمت طاری تھی، اور انکے نازل و ادبار کی اصلی بنیاد اسی دن پڑی، جب اجتماع و ائتلاف کی جگہ اشتات و انتشار کی نحوسست چھانی شروع ہو گئی۔ ابتدا میں ہر مادہ مجتمع تھا، ہر طاقت سمیٹی ہوئی تھی، ہر چیز بندھی ہوئی تھی، لیکن بہ تدریج تفرقہ و انتشار کی ایسی ہوا چلی کہ ہر بندھن کھلا، ہر جماؤ میں پھیلاؤ ہوا، ہر ملی جلی اور اکٹھی طاقت الگ الگ ہو کر منتشر اور تتر بتر ہو گئی۔ قرآن حکیم کے بتلائے ہوئے قانون نازل اقوام کے مطابق یہ حالت ہر چیز ازار ہو کر شے وجود و عمل پر طاری ہوئی، اور ایک ہزار برس پر تین صدیاں گزر چکی ہیں کہ برابر طاری ہو رہی اور بڑھتی جاتی ہے۔ لوگ اسباب نازل امت پر بحمت کرتے اور پھر طرح طرح کی علمیں تھرتے اور طرح طرح کے ناموں سے

موسوم کرتے ہیں " حالانکہ دراصل قرآن رسنۂ اور عقلیات صادقہ کے نزدیک تنزل کے تمام فسادات و نتائج صرف اسی ایک چیز کا نتیجہ ہیں - اس ایک حقیقت کو کتنے ہی مختلف ناموں سے پکار لو، مگر اصلی علت اسکے سوا کوئی نہیں ہے -

قوتوں کے انتشار کا دور ساری چیزوں پر طاری ہوا، لیکن یہاں صرف ایک ہی پہلو واضح کرنا مقصود ہے - آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود اسلامی طاقت کی اصلی شخصیت تھی - آپ جب دنیا سے تشریف لیگئے تو صرف ایک داعی شریعت یا حامل رحي ہی کی جگہ خالی نہیں ہوئی، بلکہ اُن ساری قوتوں، سارے منصبوں، ساری حیثیتوں، اور ہر طرح کے نظری و عملی اختیارات و قوی کی، جو آپ کی شخصیت مقدسہ میں اکٹھی تھیں، اور جن کا آپ کے تنہا وجود مقدس میں جمع ہونا اسلام کی شرعی و دینی خصوصیات میں سے تھا - اسلام کا داعی مسیحیت کے مقدس پہاڑی واعظ کی طرح صرف ایک اخلاقی معلم ہی نہ تھا، اور نہ دنیا کے فاتح حکمرانوں کی طرح محض ایک جہانگیر اور عالم سنان شہنشاہ - اسلام نے دین کو دنیا سے اور شریعت کو حکومت و جہانبانی سے الگ نہیں رکھا - وہ تو یہ سکھانے آیا تھا کہ دین اور دنیا دو نہیں ایک ہی چیز ہیں، اور شریعت سے حکومت و سلطنت الگ نہیں ہے، بلکہ سچی حکومت اور خدا کی مرضی کے مطابق سلطنت وہی ہے جس کو شریعت نے خون پیدا کیا ہو، خرد اپنی گودوں میں پالا ہو، اور اُس کے تاج و تخت کے اندر بپتھر جسم کیلئے روح کی طرح کام کر رہی ہو - پس اسلام کے داعی اول کا وجود ایک ہی وقت میں اُن تمام حیثیتوں اور منصبوں کا جامع تھا، جو ہمیشہ دنیا کی صدها مختلف شخصیتوں کے اندر منقسم رہی ہیں - وہ اللہ کا پیغامبر تھا، شریعت کا مقنن تھا، امت کا بانی تھا، ملکوں کا حاکم اور سلطنت کا مالک تھا - وہ پتوں اور چہال سے پتی ہوئی مسجد کے ممبر پر رحي الہی کا ترجمان اور انسانی سعادت و ہدایت کا راعظ تھا، تو اُسی کے صحن میں یمن کا خراج تقسیم کرنے والا اور فوجوں کو میدان جنگ میں بھیجنے کیلئے طیار کرنے والا بھی تھا - وہ ایک ہی وقت اور ایک ہی زندگی میں جبکہ گہر زکا نظام معاشرت درست کرتا اور نکاح و طلاق کے قوانین نافذ کرتا تھا، تو ساتھ ہی بدر کے کنارے دشمنوں کا حملہ بھی روکتا، اور مکہ کی گھاٹیوں میں سے ایک فاتح حکمران کی طرح گزرتا تھا - غرض کہ اُس کی ایک شخصیتیں

کے اندر مختلف حیثیتیں اور منصب جمع تھے، اور اسلام کا نظام دینی یہی تھا کہ یہ ساری قوتیں ایک ہی فرد میں جمع رہیں۔ جب آپ دنیا سے تشریف لیگئے تو خلفاء راشدین کی خلافت خاصہ اسی اجتماع قوی و منصب کی نیابت کاملہ پر قائم ہوئی، اور اسی لیے اُسکو ”منہاج نبوت“ سے تعبیر کیا گیا۔ یعنی یہ نیابت تھیک تھیک ہر لحاظ اور ہر پہلو سے شخص جامع نبوت کی سچی قائم مقامی اپنے اندر رکھتی تھی۔ منصب نبوت مختلف اجزاء نظر و عمل سے مرکب ہے۔ ازاں جملہ ایک جزءِ وحی و تنزیل کا مورد ہونا اور شریعت میں تشریع و تاسیس قوانین کا اختیار رکھنا ہے۔ یعنی قانون وضع کرنا اور اسکے وضع و قیام کی معصومانہ و غیر مسئولانہ قوت۔ اس جزء کے اعتبار سے ثر نبوت آپکے وجود پر ختم ہو چکی تھی اور قیامت تک کیلئے شریعت و قانون کے وضع و قیام کا معاملہ کامل ہو چکا تھا۔ جب نعمت کامل ہو گئی تو پھر کامل چیز ہی کو ہمیشہ باقی رہنا چاہیے۔ اسکی جگہ کسی دوسری چیز کا آنا نقص کا ظہور ہوگا نہ کہ تکمیل کا : الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی رضیت لکم الاسلام دینا (۵ : ۴) لیکن منصب نبوت اس اصلی جزء کے ساتھ بہت سے تبعی اجزاء پر بھی مشتمل تھا، اور ضرور تھا کہ اُنکا دروازہ ہمیشہ کھلا رہے۔ امت کے قیام اور سعادت و ہدایت کے بقاء کیلئے اُنکا سلسلہ تا قیامت جاری رہنے والا تھا اور جاری رہا۔ اس چیز کو مختلف احادیث میں مختلف تعبیرات سے موسوم کیا ہے۔ حضرت عمر کیلئے ”محدث“ (بالفتح) کا مقام بتلایا گیا۔ علماء کو انبیاء کا وارث کہا گیا۔ انبیاء بنی اسرائیل سے تشبیہ دی۔ مبشرات صادقہ کو نبوت کا چالیسواں جزء قرار دیا۔ ”لم یبق الا المبشرات“ حدیث تحدید بھی اسی سلسلہ میں داخل ہے۔ پس خلفاء راشدین کو جو نیابت پہنچی، اُس میں وحی و تشریع کی قائم مقامی تو نہیں ہو سکتی تھی، لیکن اگر تمام اجزاء و خصائص نبوت کی نیابت داخل تھی۔ پھر چونکہ داعی اسلام کا وجود نبوت کے ساتھ خلافت ارضی، حکومت و سلطنت، نظام و قوام سیاست، قیادۃ فوج و حرب، فتح و عمران ممالک، ریاست مجتہدین شریعی، وغیرہ، جہاں بانی و حکمرانی کے تمام منصب تنہا اپنی شخصیت ہی کے اندر رکھتا تھا، اسیلئے تھیک تھیک اسی طرح خلافت خاصہ میں بھی خلفاء راشدین کا تنہا وجود ان ساری نظری و عملی قوتوں اور تمام منصبوں کا جامع ہوا۔ وہ ایک ہی وجود کے اندر صاحب امامت

و خلافت بھی تھے، صاحب اجتہاد و قضاء بھی تھے، اور صاحب سیاست و نظم احکام و بلاد بھی تھے۔ اصلاً ”امامت کبریٰ“ کا مقام اجتہاد دینی اور سیاست ملکی، دونوں پر حاوی ہے۔ اسلیئے آنکی امامت میں یہ دونوں قسمیں اپنی تمام شاخوں کے ساتھ اکتہی تھیں۔ حضرت عمر مسجد کے دار الشریعہ میں مسائل شرعیہ کا بہ حیثیت ایک مجتہد کے فیصلہ کرتے تھے، عدالت میں مقدمات سناتے تھے، اور دیوان فوجی میں فوجوں کو تنخواہ بھی بانٹتے تھے۔ اگر وہ نماز جنازہ کی معین تکبیرات پر صحابہ کا اجماع کراتے تھے، تو راتوں کو شہر میں گشت اگا کر احتساب کا فرض بھی ادا کرتے تھے۔ میدان جنگ میں احکام بھی بھیجتے، اور روم کے سفیر کو بہ حیثیت شہنشاہ اسلام اپنے سامنے بھی بھی بلاتے۔

اسی طرح نبوت کا مقام، تعلیم و تربیت امت کی مختلف قوتوں سے مرکب تھا۔ قرآن حکیم نے انکو تین اصولی قسموں میں بانٹ دیا ہے:

یتلو علیہم آیاتہ، و یرزیکہم، و یعلمہم الکتاب و الحکمۃ (۳: ۶۲) تلاوت آیات - تزکیۃ نفوس - تعلیم کتاب و حکمت - خلفاء راشدین ان تینوں منصبوں میں وجود نبوت کے نائب تھے۔ وہ منصب اجتہاد و قضاء شرع کے ساتھ قوت ارشاد و تزکیۃ و تربیت بھی رکھتے تھے۔ وہ ایک صاحب رحمی کی طرح خدا کے کلام کی مذاہبی کرنے والے، ایک نبی کی طرح دلوں کا تزکیہ اور ررحوں کو پاک کردینے والے، اور ایک رسول کی طرح تعلیم کتاب اور حکمت سنت سے امت کی تربیت و پرورش کرنے والے تھے۔ وہ ایک ہی وجود میں ابو حنیفہ و شافعی بھی تھے (رح) اور جنید و شبلی بھی (رح) - نخعی و حماد بھی تھے، اور ابن معین و ابن راہویہ بھی (رح)۔ جسموں کا نظام بھی انہی کے ہاتھوں میں تھا۔ دلوں کی حکمرانی بھی انہی کے قبضہ میں تھی۔ یہی حقیقی اور کامل معنی منصب نبوت کی نیابت کے ہیں۔ اور اسی لیے انکا وجود اور انکے اعمال بھی اعمال نبوت کا ایک آخری جزء تھے کہ ”علیکم بسنتی و سنتہ الخلفاء الراشدین“ اور اسی لیے ”وعضوا علیہا بالدواجہ“ کے حکم میں نہ صرف سنت عہد نبوت، بلکہ خلافت راشدہ و خاصہ کی سنت بھی داخل ہوئی، اور شرح اس سر الہی کی بہت طرانی ہے۔ یہاں محض اشارات مطلوب۔

لیکن جیسا کہ پہلے سے خبر دیدی گئی تھی، اجتماع و ائتلاف کی یہ حالت حضرت علی علیہ السلام پر ختم ہو گئی، اور اسکے بعد سے اشتات و انتشار کا دور شروع ہوا۔ از انجملہ مرکزی قوتوں اور منصبوں کا انتشار و اشتات تھا، جس نے فی الحقیقت امت کا تمام نظام شرعی و اصلی درہم برہم کر دیا۔ خلافت خاصہ کے بعد یہ ساری یکجا قوتیں الگ الگ ہو گئیں۔ ایک وجود کی جگہ مختلف وجودوں میں انکا ظہور اور نشو و نما ہوا۔ حکومت و فرمان روائی کا تکرر الگ ہو کر مجرد پادشاہی کی شکل میں آ گیا۔ اسی کی طرف اشارہ تھا ”الخلافة بعدی ثلاثون سنة ثم ملک“ سوراہی اسکے بعد صرف پادشاہی ہی رہ گئی۔ اجتہاد اور قضاء شرعی کا جزء خلافت سے الگ ہوا تو مجتہدین و فقہاء کی ایک الگ جماعت پیدا ہو گئی۔ انہوں نے یہ کام سنبھالا۔ اسی طرح تعلیم و تربیت و روحانی کے کاروبار سے نظام حکومت بالکل الگ ہو گیا۔ پہلے خلافت کی ایک ہی بیعت تمام مقاصد کی کفیل تھی۔ اب خلیفہ کا وجود محض پادشاہی کیلئے اور فقہاء کا وجود مجرد استنباط احکام و مسائل کیلئے رہ گیا، تو ترکیب نفوس اور ارشاد قلوب کیلئے ایک دوسری بیعت مستقل قائم ہوئی، جو بیعت توبہ و ارشاد ہوئی، اور اس طرح اصحاب طریقت و تصرف کی بنیاد پڑی۔ پہلے صرف ایک وجود تھا۔ وہ پادشاہ، مجتہد، مرشد و ہادی، قاضی القضاۃ، سپہ سالار جنگ، مدیر عدل و احتساب، سب کچھ تھا۔ اب یہ ساری قوتیں الگ الگ ہو گئیں۔ حکومت و فرمان روائی الگ ایک وجود میں آئی۔ اجتہاد و فقہ کیلئے دوسرا وجود مرکز بنا۔ قضاء کیلئے تیسرا۔ ارشاد و ترکیب قلوب کیلئے چوتھا۔ و ہلم جرا۔ اس طرح عہد اجتماع قوی و مناصب کے بعد دور انتشار قوی و مناصب شروع ہو کر رفتہ رفتہ کمال ظہور و بلوغ تک پہنچ گیا۔ حتیٰ کہ یہ تمام قوتیں اس طرح ایک دوسرے سے بیگانہ و مخالف ہو گئیں کہ یا تو ایک ہی وجود میں جمع تھیں، یا اب مختلف وجودوں میں بت کر بھی متفق نہ رہ سکیں۔ صرف اختلاف تعدد و تدرع ہی نہیں رہا، بلکہ اختلاف تضاد کی شکل پیدا ہو گئی۔ یہی سب سے بڑی مصیبت و ہلاکت تھی جو امت پر طاری ہوئی۔ مسلمانوں کے تدرع و ادبار کی اصلی علت یہ ہے۔ وہ افسانے نہیں ہیں جن میں تم سر مست ہو۔ افسوس کہ سطحی و جزئی حالات کے استغراق نے اصلی اسباب و علل پر غور کرنے کی تمہیں کبھی مہلت نہ دی، اور نہ بحث و نظر میں یورپ کی تقلید سے آزاد ہو سکہ کہ خالص اسلامی نظریے اسباب ترقی و تدرع پر تدبر کرتے!

غرضکہ خلافت راشدہ کے بعد جو سلسلہ خلافت قائم ہوا، وہ خواہ قرشی رہا ہو یا غیر قرشی، مجرد ملوکی و پادشاہی کا سلسلہ تھا، اور بجز چند مستثنیٰ اوقات کے (جیسا کہ عہد حضرت عمر بن عبد العزیز) یہ نیابتِ نبوت کے آرر تمام اجزاء سے یکقلم خالی تھا۔ منصبِ بت چکے تھے اور قوتیں منتشر ہو چکی تھیں۔ البتہ جو انقلاب سلطان عبد الحمید خان کے زمانے میں ہوا اور جس کا نتیجہ سلاطین عثمانیہ کی خلافت کا طریق استبدادی و شخصی سے طریق شوری میں تبدیل ہو جانا ہے اور جس دور کے اولین خلیفہ سلطان محمد خاں خامس اعلیٰ اللہ مقامہ تھے، سربلاشبہ یہ خلافت راشدہ کی طرف عود و رجعت کا ایک مبارک قدم تھا، جسکے لیے شوری اور پارلیمنٹ کا ہونا سب سے پہلی شرط ہے۔ لیکن ان جزئی مستثنیات کے علاوہ عام حالات و خصائص ہر دور اور ہر سلسلے کے رہی رہے جو ایک جامع لفظ "ملک عضو" میں بتلا دیے گئے تھے، اور اس میں کبھی کوئی نمایاں اور پائدار تبدیلی نہ ہوئی۔

(اطاعت خلیفہ و التزام جماعة)

اس اجمالی تمہید کے بعد سب سے زیادہ اہم مسئلہ سامنے آتا ہے۔ یعنی اسلام کا وہ نظام شرعی جو ہر مسلمان کو خلیفۂ رقت کی معرفت اور اطاعت پر اسی طرح مجبور کرتا ہے، جس طرح اللہ اور اسکے رسول کی اطاعت پر، جب تک کہ وہ اللہ اور اسکے رسول کے خلاف کوئی حکم نہ دے۔ میں چاہتا ہوں کہ کسی قدر وضاحت کے ساتھ اس مسئلہ کی تشریح کر دوں۔ اسلام کا قانون اس بارے میں اپنی تمام شاخوں اور تعلیموں کی طرح فی الحقیقت کائنات ہستی کے قدرتی نظام کا ایک جزء اور قوام ہستی کی زنجیرِ فطرۃ کی ایک قدرتی کڑی ہے۔ کائنات کے ہر حصہ اور ہر گوشہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ کی قدرت و سنۃ ایک خاص نظام پر کار فرما ہے جسکو قانون "مركزية" یا قانون "دائر" سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ یعنی قدرت نے خلقت و نظام خلقت کے بقا و قیام کیلئے ہر جگہ اور ہر شاخ وجود میں یہ صورت اختیار کر رکھی ہے کہ کوئی ایک وجود تو بمنزلۃ نقطۃ مرکز کے ہوتا ہے، اور بقیہ اجسام ایک دائرہ کی شکل میں اسکے چاروں طرف وجود پاتے ہیں، اور پورے دائرہ کی زندگی اور بقا صرف اُس مرکزی وجود کی زندگی اور بقا پر موقوف ہوتی ہے۔ اگر ایک چشمِ زن کیلئے بھی دائرہ کے اجسام اپنے مرکز سے الگ ہجائیں، یا مرکز کی اطاعت و انقیاد سے باہر ہجائیں، تو معاً نظام

ہسٹلی درہم برہم ہوجائے اور دائرہ کی اکیلی ہستیاں مرکز سے الگ رہیں کبھی قائم رہتی نہ رہسکیں - مرکز سے مفارقت اور تخلف کے ساتھ ہی فنا و ہلاکت آنپڑ طاری ہوجائے - یہی وہ حقیقت ہے جسکو بعض اصحاب اشارات و کشف نے یوں تعبیر کیا کہ ”الحقیقہ کا لکڑہ“ یہ قانون مرکزیت و دائرہ نظام ہسٹلی کے ہر جز اور ہر حصہ میں صاف صاف دیکھا جاسکتا ہے - یہ نظام شمسی جو ہمارے اوپر ہے ستاروں کی یہ گنجائش آبادی کروں کا یہ صحرا بے کنار زندگی اور حرکت کا یہ معجز العقول طلسم کیا ہے ؟ کس نظام پر یہ پورا کارخانہ چل رہا ہے ؟ اسی قانون مرکزیت پر - متحرک سیاروں کے حلقے اور دائرے ہیں اور ہر دائرہ کا نقطہ حیات و بقا سورج کا مرکزی نقطہ ہے - تمام ستارے اپنے اپنے کعبہ مرکز کا طواف کر رہے ہیں اور ہر دائرہ کی ساری زندگی اور بقا صرف مرکز شمسی کی اطاعت و انقیاد پر موقوف ہے : ذلک تقدیر العزیز العظیم خرد ہماری زمین بھی ایک ایسے ہی دائرہ کی ایک کڑی ہے اور شب و روز اپنے مرکز کے طواف و انقیاد میں مشغول ہے - ہر ستارے کے طواف دوران کیلئے حکمت الہی نے ایک خاص راہ اور ایک خاص زمانہ قرار دیدیا ہے - اور وہ اُس سے باہر نہیں جاسکتا - سب بحکم ولہ اسلم من فی السموات والارض (۲ : ۸۳) اور ان اللہ یسجدلہ من فی السموات ومن فی الارض والشمس والقمر والنجوم (۲۲ : ۱۹) خدا کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق اپنی اپنی جگہوں میں کام کر رہے ہیں : لاالشمس ینبغی لہا ان تدرك القمر ولا الیل سابق النهار وکل فی فلک یسبحون (۳۶ : ۴۱)

قانون مرکزیت کا یہ پہلا اور بلند ترین نظارہ تھا - اب اسکے بعد جسقدر نیچے آئیں گے اور بلند سے بلند گوشوں سے لیکر چھوٹے سے چھوٹے گوشوں تک نظر ڈالیں گے ہر جگہ زندگی اور بقا اسی قانون سے وابستہ نظر آئیگی - عالم نباتات میں درخت کو دیکھو - اسکی ایک مجتمعہ وحدہ کتنی وسیع کثرت سے مرکب ہے ؟ ڈالیاں ہیں ، شاخیں ہیں ، پتے ہیں ، پھول ہیں - لیکن سب کی زندگی ایک ہی مرکز یعنی جڑ سے وابستہ ہے - جڑ سے جہاں کوئی شاخ الگ ہوئی ، موت و فنا آپڑ طاری ہوگئی - آفاق کو چھوڑ کر عالم انفس کی طرف آؤ ، اور خورد اپنے وجود کو دیکھو جسکے دیکھنے کیلئے نظر اٹھانے کی بھی ضرورت نہیں - تمہارا وجود نئے مختلف ظاہری و باطنی اعضاء سے مرکب ہے ؟ جسموں اور وجودوں کی ایک پوری ہسٹلی ہے

جو ٹم میں آباد ہے - ہر جسم کا فعل ہے اور ایک خاصہ - لیکن دیکھو، یہ ساری آبادی کس طرح ایک ہی مرکز کے آگے سر بسجود ہے ؟ سب کی حیات کا مرکز صرف قلب ہے - اس سے الگ رھکر ایک عضو بھی زندہ نہیں رھ سکتا ” اذا صلحت ، صلحت کلھا ، و اذا فسدت ، فسدت کلھا “

اسلام فی الحقیقت سنتہ اللہ اور فطرت اللہ ہی کا دوسرا نام ہے - اگر نوع انسانی کی سعادت و ارتقاء کیلئے قانون اسلام اسی فاطر السموات و الارض کا بنایا ہوا ہے جس نے تمام کائنات کی زندگی کیلئے ایک خاص نظام بنایا ، تو ضرور ہے کہ دونوں میں اختلاف نہ ہو، بلکہ پہلا قانون پچھلے قانون عام کا ایک ایسا قدرتی جزو نظر آئے، جیسے کسی زنجیر کی ایک کڑی - پس اسلام کا نظام شرعی بھی ٹھیک ٹھیک اسی قانون مرکزی پر قائم ہوا - قرآن نے یہ حقیقت جابجا واضح کی ہے کہ جس طرح اجسام و اشیاء کی زندگی اپنے اپنے مراکز سے وابستہ ہے، اسی طرح نوع انسانی اور اس کی جماعت و افراد کا جسمانی و معنوی بقاء بھی قانون مرکزی پر منحصر ہے - جس طرح ستاروں کی زندگی اور حرکت کا مرکز و محور سورج کا وجود ہے - اسی طرح نوع انسانی کا بھی مرکز سعادت انبیاء کرام کا وجود ہے - پس ان کی اطاعت و انقیاد بقاء و حیات کیلئے ناگزیر تھری : وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باللہ (۴ : ۶۸) اور اسی لیے فرمایا : فلا وربک لا یؤمنون حتی یتکلموک فیما تنہی بینہم ، ثم لا یجدوا فی انفسہم حرجاً مما فضیت ویسلموا تسلیمًا (۴ : ۶۹) اور لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنہ - پھر قوم و ملت کے بقاء کیلئے ہر طرح کے دائرے اور ہر طرح کے مرکز قرار دیے - اعتقاد میں اصلی مرکز عقیدہ توحید کو تھرایا جس کے گرد تمام عقائد کا دائرہ قائم ہے : ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ و یغفر ما دون ذلک لمن یشاء (۴ : ۵۲) عبادات میں صلوات مرکز قرار پایا جس کے ترک کے بعد تمام دائرہ اعمال منہدم ہو جاتا ہے - ” فمن اقامہا اقام الدین ، و من ترکہا فقد ہدم الدین “ - اور اسی لیے یہ بات ہوئی کہ ” کان اصحاب رسول اللہ صلعم لا یرون شئیا من الاعمال ترکہ کفر غیر الصلوۃ (ترمذی) اسی طرح تمام قوموں اور ملکوں کا ارضی مرکز سعادت رادی حجاز کا کعبۃ اللہ قرار پایا : جعل اللہ الکعبۃ البیت الحرام قیاما للذاس - اور چونکہ یہ مرکز تھا ، اس لیے تمام دائرہ کارخ اسی طرف ہوا - خواہ دنیا کی کسی جہت میں مسلمان ہوں، لیکن اُنکا مذہب اسی طرف ہونا چاہیے :

و حیث ما کنتم فلوا و جوہکم شطرہ (۲ : ۱۴۵)

پھر جس طرح شخصی اور اعتقادی و عملی زندگی کیلئے ہرگز قرار پائے، ضرورتاً کہ جماعتی اور ملی زندگی کے بقاء کیلئے بھی ایک مرکزی وجود قرار پاتا۔ لہذا وہ مرکز بھی قرار دیدیا گیا۔ تمام امت کو اس مرکز کے گرد بطور دائرہ کے گھرایا۔ اسکی معیت، اسکی رفاقت، اسکی اطاعت، اسکی حرکت پر حرکت، اسکے سکون پر سکون، اسکی طلب پر لبیک، اسکی دعوت پر اتفاق جان و مال، ہر مسلمان کیلئے فرض کر دیا گیا۔ ایسا فرض جسکے بغیر وہ جاہلیہ کی ظلمت سے نکل کر اسلامی زندگی کی روشنی میں آ نہیں سکتا۔ اسلام کی اصطلاح میں اسی قومی مرکز کا نام ”خلیفہ“ اور ”امام“ ہے، اور جب تک یہ مرکز اپنی جگہ سے نہیں ہٹتا ہے، یعنی کتاب و سنۃ کے مطابق اسکا حکم ہے، ہر مسلمان پر اسکی اطاعت و اعانت اسی طرح فرض ہے جس طرح خود اللہ اور اسکے رسول کی :

یا ایہا الذین آمنوا اطیعوا اللہ
و اطیعوا الرسول و اولی
الامر منکم - فان تنازعتم
فی شئی فردوہ الی اللہ
و الرسول، ان کنتم ترمزون
باللہ و الیوم الآخر - ذلک
خیر و احسن تازیلا -

مسلمانو! اطاعت کرو اللہ کی، اسکے
رسول کی، اور تم میں جو اولی الامر ہو،
اسکی۔ پھر اگر کسی معاملہ میں تم
مختلف ہو جاؤ تو چاہیے کہ اللہ اور اسکے
رسول کی طرف لوٹو اور اسکے فیصلہ پر
متفق ہو جاؤ۔

(۴ : ۶۳)

صحابہ کی مستند تفسیر بالاتفاق یہ ہے کہ ”اولی الامر“ سے مقصود خلیفہ و امام ہے۔ البتہ تبعاً امراً و مجتہدین اور اصحاب حل و عقد بھی اسمیں داخل ہو سکتے ہیں جنسے اسلام کی حکومت شریعہ مرکب ہوئی ہے۔ خود قرآن سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ اسی سررہٴ نساء میں آگے چل کر ہے : و لردوہ الی الرسول و الی اولی الامر منہم، بعلمہ الذین یسنبطونہ منہم (۴ : ۸۶) ظاہر ہے کہ یہاں ”اولی الامر“ سے مقصود بجز حاکم و امیر کے اور کوئی نہیں ہے۔ عالم یا مجتہد و فقیہ نہیں ہو سکتا۔ ملکی اور جنگی معاملات کا ذکر ہے۔ سیاق و سباق بتلا رہا ہے کہ معاملہ فتنہ و مسائل کا نہ تھا۔ جنگ کا تھا۔ علاوہ اسکے احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ خود یہ آیت جس واقعہ کی نسبت آنی ہے، وہ امیر و امام کی اطاعت ہی کا معاملہ تھا۔ صحیح مسلم میں ہے ”قال ابن جریج : فذل یا ایہا الذین آمنوا اطیعوا اللہ

و اطیع الرسول و اولی الامر منکم فی عبد اللہ بن حذافہ بن قیس بن عدی السہمی، بعثہ النبی صلعم فی سریتہ " تاریخ اسلام کے سب سے بڑے فقیہ امام بخاری کا بھی مذہب یہی ہے۔ کتاب الاحکام میں اسی آیت کریمہ کو ایک باب کا عنوان قرار دیا ہے اور اسمیں حضرت ابوہریرہ کی مشہور روایت لے ہیں: " من اطاع امیری فقد اطاعنی و من عصی امیری فقد عصانی " اس سے معلوم ہوا کہ اس آیت میں " اولو الامر " کی اطاعت سے مقصود امیر کی اطاعت ہے۔

" فان تنازعتم فی الخ سے یہ حقیقت بھی واضح ہوگئی کہ اسلامی خلیفہ کا وجود مسیحیت کے پرپ سے کس درجہ مختلف ہے جو اسلام کے نزدیک اربابا من دون اللہ میں داخل ہے۔ مسیحیت کا خلیفہ ' ارضی خلیفہ نہیں ہے۔ آسمانی و دینی فرمانروا ہے جو مذہب کی آخری طاقت اپنے قبضہ میں رکھتا ہے۔ بر خلاف اسلامی خلیفہ کے جسکے وجود کی اصلی بنا خلافت ارضی یعنی حکومت و سلطنت ہے۔ وہ صرف شریعت اور امت کی حفاظت کرنے والا اور احکام شریعت نافذ کرنے والا ہے۔ یعنی محض ایک قوت نافذہ ہے۔ نہ کہ مقننہ۔ اسکی ذات کو اصل شریعت اور اسکے احکام میں کوئی دخل نہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو فرتہ الی اللہ و الرسول نہ فرمایا جاتا۔ یعنی اگر کوئی ایسی صورت پیش آجائے جسمیں نزاع و اختلاف پیدا ہو، تو پھر اسکے آخری فیصلہ کی قوت خلیفہ کا حکم نہیں ہے بلکہ مرکز ارضی و حقیقی کا۔ یعنی قرآن و سنت کا۔ اور خود خلیفہ بھی اسکی اطاعت پر اسی طرح مجبور ہے جس طرح جماعت امت کا ہر عام فرد۔

احادیث صحیحہ سے اسکی مزید توضیح ہوگئی ہے۔ اس بارہ میں اس کثرت کے ساتھ احادیث و آثار موجود ہیں، اور عہد صحابہ سے لیکر عہد تدوین کتب تک مختلف طبقات روات و حفاظ میں اسقدر انکی شہرت رہ چکی ہے کہ اسلام کے عقیدہ توحید و رسالت کے بعد شاید ہی کوئی اور چیز اس درجہ تواتر و یقین تک پہنچی ہوگی۔ سب سے پہلے میں مسند امام احمد وغیرہ کی ایک روایت نقل کررنگا جسمیں بالترتیب اسلام کا جماعتی نظام بیان کیا گیا ہے " قال صل اللہ علیہ وسلم : انا امرکم بخمس، اللہ امرنی بہن : الجماعة، و السمع و الطاعة، و الهجرة، و الجہاد فی سبیل اللہ - فاند من خرج من الجماعة قید شبر، فقد خلع ربقة الاسلام من عنقه الا ان یراجع " و من دعا بدعوی جاہلیۃ نہر من جنی جہنم - قالوا یا رسول اللہ و ان صام و صلی ؟

قال ران صلی و صام و زعم انه مسلم - فادعوا المسلمين باسمائهم علی ما سماهم الله - المسلمین المؤمنین عبداً لله “ اخرجہ احمد و الحاكم من حدیث العارث الاشعری علی شرط الصحیحین - قال ابن کثیر هذا حدیث حسن رلہ الشراہد -

یعنی فرمایا - میں تم کو پانچ باتوں کیلئے حکم دیتا ہوں جنکا حکم مجھے اللہ نے دیا ہے - جماعت ، سمع و طاعة ، ہجرت ، اور اللہ کی راہ میں جہاد - یقین کر رکھو کہ جو مسلمان جماعت سے ایک بالشٹ بھر بھی باہر ہوا تو اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے نکال دیا ، اور جس نے اسلام کی جماعتی زندگی کی جگہ جاہلیہ کی بے قیدی کی طرف بلایا تو اسکا ٹھکانا جہنم ہے - لوگوں نے عرض کیا - کیا ایسا شخص جہنمی ہوگا اگرچہ روزہ رکھتا ہو اور نماز پڑھتا ہو ؟ فرمایا ہاں - اگرچہ روزہ رکھتا ہو ، نماز پڑھتا ہو ، اور اپنے زعم میں اپنے تئیں مسلمان سمجھتا ہو -

اس حدیث میں پانچ باتیں بتلائی ہیں :

پہلی چیز ”جماعت“ ہے - یعنی تمام امت کو ایک خلیفہ و امام پر اکٹھا ہوکر اور اپنے مرکز قومی سے ملحق ہوکر رہنا چاہیے - الگ الگ نہیں رہنا چاہیے - آگے چلکر کثرت کے ساتھ رہ حدیثیں ملینگی جن سے معلوم ہوگا کہ جماعت سے الگ ہوکر رہنے کو اسلام نے غیر اسلامی اور ابلیسی راہ قرار دیا ہے ، اور ابھی آپ سن چکے ہیں کہ انفرادی زندگی کو قرآن ، کربی زندگی ہی نہیں مانتا - اسلامی زندگی جماعت ہے -

دوسری بات ”سمع و الطاعة“ ہے - یعنی خلیفہ کی کامل درجہ کی اطاعت - ایسی اطاعت کہ بس سننا اور اسی پر بلا چون و چرا چلنا -

تیسری بات ”ہجرت“ ہے - ہجرت ہجر سے ہے جسکے معنی ترک کر دینے اور چھوڑ دینے کے ہیں - اسلام کی اصطلاح میں جب کبھی کوئی فرد یا جماعت سعادت و صداقت کے کسی مقصد اعلیٰ کیلئے اپنی دنیاوی معبودات و مآلوفات ترک کر دے - مثلاً دولت کو ، آرام و راحت کو ، عزیز و اقرباء کے قرب کو ، وطن و مکان کو ، تو اسکا نام ہجرت الی اللہ اور ذہاب الی اللہ ہے - خدا کے ہر رسول اور انکے پیروں کو پیام حق کی راہ میں یہ منزل طے کرنی ہوتی : انی مہاجر الی ربی - اور انی ذاہب الی ربی - چونکہ وطن و مکان کا علاقہ ایک ایسا علاقہ ہے جسکے

ترک کرنے میں اہل رعیال، مال و متاع، دوست و احباب، ہر طرح کے علاقوں کو ترک کر دینا پڑتا ہے، اور اسکی محبت و الفت کی زنجیر اور ساری زنجیروں سے بہاری ہے، اسلیے ترک وطن کی ہجرت اعلیٰ اور جامع قسم کی ہجرت ہوئی، اور زیادہ تر اطلاق مہاجرۃً یا تارکین وطن ہی پر کیا گیا۔ ”الکل امری ما نومی۔ فمن کانت ہجرتہ الی اللہ ورسولہ، فہجرتہ الی اللہ ورسولہ۔ ومن کانت ہجرتہ لدنیا یصیبہا، ارا مرآة یتنزر جہا، فہجرتہ الی ما ہاجر الیہ“ (بخاری عن عمر رض) مفردات راغب میں ہے۔ ”الہجر والہجران مفارقتہ الانسان غیرہ، اما بالبدن او باللسان او بالقلب۔ و المہاجرہ، مصارمۃ الغیر و متارکتہ“ (۵۵۸)

پانچویں چیز ”جہاد فی سبیل اللہ“ ہے۔ ”جہاد“ جہد سے ہے جسکے معنی ”استفراغ الوسع فی مدافعة العدو ظاہراً و باطناً“ ہیں (مفردات راغب) یعنی دشمن اور دشمن کی تمام قوتوں کے دفع کرنے میں انتہا درجہ کی کوشش کرنا۔ یہ کوشش زبان سے بھی ہوتی ہے۔ مال سے بھی ہوتی ہے۔ جان سے بھی ہوتی ہے۔ جس قسم کی کوشش کی ضرورت ہو۔ ہر قسم جہاد فی سبیل اللہ میں داخل ہے۔ ”و جاہدوا المشرکین باموالکم و انفسکم و السلککم“ (رواہ ابوداؤد و احمد و نسائی و ابن حبان عن انس)

یہ کہنا ضروری نہیں کہ یہی پانچ چیزیں دنیا میں قوموں اور ملکوں کے بقاؤ قیام کی اصلی بنیاد ہیں۔ دنیا میں کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی جسکی قومی ہستی ان پانچ عنصروں سے مرکب نہ ہو۔ سعی و عمل کا کوئی گوشہ ہو، کامیابی بغیر ان اصول خمسہ کے ممکن نہیں۔ ایک مٹھی گیہوں کے حصول سے لیکر قطب شمالی کی تحقیق تک، اور چاندی سونے سے لیکر خدا اور اسکی محبت تک، کوئی چیز بغیر جماعت، اطاعت، ہجرت، اور جہاد کے حاصل نہیں ہو سکتی۔ دنیا نے آج تک جو کچھ پایا ہے اور نوع انسانی نے جسقدر بھی حاصل کیا ہے، غور کر گئے تو وہ سب انہی پانچ سچائیوں کے ثمرات و نتائج ہیں۔ ایک ہی چیز مختلف بیہوسوں اور ناموں میں آکر عقلوں کو الجھا دیتی ہے، رنہ حقیقت ہر حال میں ایک ہی ہے۔ دنیا ان پانچ بنیادی حقیقتوں کو مختلف ناموں سے پکارتی اور مانتی ہے۔ دنیا میں کوئی عقل نہیں جو انکی منکر ہو سکے۔ البتہ نام کے اختلاف نے معانی پر پردہ ڈال دیا ہے۔ اگر ان کی تشریح کریں تو پوری ایک کتاب بن جائے۔ مسلمانوں نے جو کچھ پایا تھا انہی پر عمل کر کے، اور جسقدر کھویا انہی کو چھوڑ کر۔

یہاں ایک آر اہم اور قابل غور امر یہ بھی ہے کہ اس حدیث اور نیز دیگر احادیث میں ہمیشہ جماعت اور اطاعت خلیفہ کی زندگی کو اسلامی زندگی قرار دیا ہے اور اس کے عکس کو جاہلیہ - جاہلیہ کی زندگی میں ہلاکت کا اصلی تخم کیا تھا ؟ قرآن نے واضح کیا ہے کہ تفرقہ اور باہم دگر علحدگی ، اور کسی ایک مرکزی قوت کے ماتحت نہ ہونا - اسلام نے ظاہر ہو کر زندگی کی جو تخم ریزی کی ، وہ کیا تھی ؟ باہمی اتحاد و ائتلاف - تمام افراد کو ایک متحدہ جماعت بنا کر نفس واحدہ کر دیا اور سب کے سر ایک ہی چوکت پر جھکانے - ” و ان کروا نعمت اللہ علیکم ان کنتم اعداء “ فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخوانا - ” رکنتم علی شفا حفرة من النار فانقذکم منها “ الخ -

پس جاہلیہ کا دوسرا نام تفرقہ ہوا ، اور اسلام کا دوسرا نام جماعت اور التزام جماعت - یہی وجہ ہے کہ تمام احادیث میں یہ حقیقت واضح کی گئی ، اور اعلان کیا گیا کہ جو شخص جماعت اور اطاعت امام سے الگ ہو گیا تو گویا جماعت اسلام سے خارج ہو گیا - اس کی موت اسلام پر نہیں بلکہ جاہلیہ پر ہوئی - اگرچہ نماز پڑھتا ہو ، روزہ رکھتا ہو ، اور اپنے تئیں مسلمان سمجھتا ہو -

جمہور اہل اسلام کا یہ ایک ایسا متفقہ عقیدہ ہے کہ اس کو اسلامی عقیدہ ثابت کرنے کی کوشش ایسی ہی کوشش ہوگی جیسی عقیدہ توحید کے اثبات کی کوشش - جمہور اہل اسلام نے خوارج کے خلاف ابتدا سے جس چیز پر اجماع کیا ، اور ان کی سب سے بڑی علامت قرار پائی ، وہ یہی التزام جماعت و اطاعت امام فی المعروف کا مسئلہ ہے - اگرچہ غیر مستحق خلافت مسلط ہو گیا ہو - البتہ اطاعت فیما رافق الشرع میں ہے - لافى ما خالفہ -

” من اطاعنی فقد اطاع اللہ “ و من اطاع امیری فقد اطاعنی “ و من عصی امیری فقد عصانی “ (صحیحین عن ابی ہریرہ) جس نے میری اطاعت کی ، اس نے اللہ کی اطاعت کی ، اور جس نے میرے امیر کی (یعنی میرے نائب کی) اطاعت کی ، اس نے خود میری اطاعت کی ، اور جس نے امیر سے روگردانی کی ، اس نے میری اطاعت سے انکار کیا - حاصل یہ کہ امیر المؤمنین کی اطاعت عین رسول کی اطاعت ہے - مسلم کی ایک روایت میں ” امیری “ کی جگہ صرف ” الامیر “ ہے - یعنی جو شخص مسلمانوں کا امام ہو اس کی اطاعت -

”اسمعوا واطيعوا وان استعمل عليكم عبد حبشي كان راسه زبيبة“
(صحیحین عن انس) اگر ایک حقیر صرورت حبشی غلام بھی تمہارا امیر
بنا دیا جائے تو چاہیے کہ اسکی سنو اور اطاعت کرو۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ جملہ بار بار اور کثرت سے خطبوں میں آپ فرماتے
تھے۔ اسی لیے مختلف لفظوں میں اور مختلف مواقع کی نسبت
مروری ہے۔ حجة الوداع کے عظیم الشان اور یادگار عالم موقعہ پر جبکہ دو تین
ماہ کے بعد آپ دنیا سے تشریف لیجانے والے تھے اور ایک آخری اور رداعی
پیام دنیا کو سنا رہے تھے ”فرمایا“ ”لو استعمل عليكم عبد يقودكم بكتاب الله“
اسمعوا واطيعوا“ (مسلم) اگر ایک حبشی غلام بھی تم پر امیر بنادیا جائے
اور وہ کتاب اللہ کے ساتھ تم پر حکومت کرے، تو اسکی سنو اور اطاعت کرو!
”من خرج من الطاعة وفارق الجماعة فمات“ مات ميتة جاهلية“
وعن ابن عباس ”من راي من اميرة شيئا يكرهه“ فليصبر“ فانہ من فارق
الجماعة شبرا“ فمات“ فميتته ميتة جاهلية“ وفي لفظ ”فانه ليس احد
من الناس خرج من السلطان شبرا فمات عليه“ الا مات ميتة جاهلية“
(متفق عليه) یعنی جس نے جماعت کا ساتھ چھوڑ دیا۔ خلیفہ کی
اطاعت سے باہر ہو گیا، اور اسی حالت میں بغیر توبہ کے مر گیا، تو اسکی
موت جاہلیہ کی موت ہوئی (اسلام سے پہلے اہل عرب پر جو زمانہ گزرا ہے،
اسکو عہد جاہلیہ کہتے ہیں۔ پس مطلب یہ ہوا کہ عرب جاہلیہ کی طرح
گمراہی پر موت ہوئی) دوسری روایت میں ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے
امیر کو ایسی بات کرتے دیکھے جو اُسے پسند نہ آئے تو چاہیے کہ صبر
کرے۔ اسکی اطاعت سے باہر نہر۔ کیونکہ جو کوئی سلطان اسلام کی اطاعت
سے بالشت بھر بھی باہر ہوا اور اسی حالت میں مر گیا، تو اسکی موت
جاہلیہ کی حالت پر ہوئی۔ حضرت ابن عمر کی روایت میں ہے ”من خلع
يدا من طاعة“ لقي الله يوم القيامة ولا حجة له“ ومن مات وليس في عنقه بيعة“
مات ميتة جاهلية“ جس نے خلیفہ کی اطاعت سے ہاتھ کھینچا، یعنی
اطاعت نہ کی، تو قیامت کے دن وہ اللہ کے سامنے حاضر ہوگا اور اسے ایسے
کوئی بچاؤ نہرگا۔ اور جو مسلمان دنیا سے اس حال میں گیا کہ خلیفہ کی
بیعت و اطاعت کے حلقہ سے اسکی گردن خالی ہوئی، تو یقین کر کہ
اسکی موت جاہلیہ کی موت ہوئی۔

”من فارق الجماعة شبرا فکانما خلع ربة الاسلام من علمه“ (ترمذی)
 جو جماعت سے باہر ہوا تو گویا وہ اسلام کی پابندی سے باہر ہو گیا - ایک
 روایت میں ہے ”دخل النار“ (اخرجه الحاكم علی شرط الصحیحین)
 یعنی جو خلیفہ کی اطاعت سے باہر ہوا، اُسکا تھکانا درزخ ہے -

”کانت بذو اسرائیل تسوسهم الانبیاء - کلما هلک نبی - خلفہ نبی -
 وانہ لا نبی بعدی - و سیکون خلفاء فیکثرون - فالوا - فما نأمرنا ؟ قال -
 فوا بیعة الاول فالاول“ ثم اعطاهم حقهم فان الله سألهم عما استرعاهم (متفق
 علیہ) بذی اسرائیل کی رہنمائی و ریاست انبیاء کرتے تھے - ایک نبی گیا تو
 دوسرا اُسکی جگہ مامور ہوا - لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے - البتہ
 خلفاء ہونگے - لوگوں نے عرض کیا - ہم کو اُنکی نسبت کیا حکم ہوتا
 ہے ؟ فرمایا - جس سے پہلے بیعت کی یعنی جس کی حکومت پہلے مان لی
 گئی، اُسکی اطاعت مقدم ہے - پھر کسی دوسرے کو خلیفہ نہ مانو - اور
 فرمایا - اُنکا تم پر جو کچھ حق ہے، رہ اُنکے حوالے کر - یعنی اُنکی طاعت کر -
 زکوٰۃ و خراج وغیرہ اُنہی کو دو -

انکے علاوہ بے شمار احادیث ہیں - اجماع کے شواہد اور کتب عقائد
 و فقہ کے اقوال نقل نہیں کرتا کہ مشہور و معروف ہیں، اور احادیث کے
 بعد اُنکی ضرورت نہیں -

(شرائط امامت و خلافت)

تمام نصوص و دلائل کتاب و سنۃ اور اجماع امت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا
 ہے کہ شریعت نے شرائط امامت و خلافت کے بارے میں درمورتیں اختیار کی
 ہیں - اور قدرتی طور پر یہی درمورتیں اس مسئلہ کی ہوسکتی تھیں -
 اسلام نے اس بارے میں نظام عمل یہ مقرر کیا تھا کہ امام کے انتخاب
 کا حق امت کو ہے - اور طریق انتخاب جمہوری تھا نہ کہ شخصی
 و نسلی - یعنی قوم اور قوم کی اصحاب الراے جماعت (اہل حل و عقد)
 کو شرائط و مقاصد خلافت کے مطابق اپنا خلیفہ منتخب کرنا چاہیے - بحکم
 و امرہم شوری بینہم بنیاد تمام امور کی شرعاً شوری یعنی باہمی مشورہ ہے -
 نہ کہ نسل و خاندان - خلافت راشدہ کا عمل اسی نظام پر تھا - خلیفہ اول کا
 انتخاب عام جماعت میں ہوا - خلیفہ دوم کو خلیفہ اول نے نامزد کیا اور
 اہل حل و عقد نے منظور کر لیا - خلیفہ سوم کا انتخاب جماعت شریعی

نے کیا - خلیفہ چہارم کے ہاتھ پر خون تمام جماعت نے بیعت کی - نسل ' خاندان ' راجی عہدی ' کو اسمیں کوئی دخل نہ تھا - اگر دخل ہوتا تو ظاہر ہے کہ خلافت خلیفہ اول کے خاندان میں آجاتی ' یا دم و سوم کے خاندان میں ' حالانکہ ایسا نہیں ہوا - خلیفہ دوم نے یہ بات بھی گوارا نہ کی کہ اُنکا فرزند اصحاب شوری میں شامل ہو -

پس پہلی صورت یہ ہے کہ اگر صحیح نظام شرعی قائم ہو جو خالص جمہوری ہے ' اور قوم کو اپنا خلیفہ منتخب کرنے کا موقع ملے ' تو کیسا شخص منتخب کرنا چاہیے ؟ اور اسمیں کیا کیا اوصاف ہونا چاہیئیں ؟

دوسری صورت یہ ہے کہ اگر یہ نظام باقی نہ رہا ہو - قوم کی راے اور انتخاب کو اسمیں دخل نہ ہو - محض طاقت اور تسلط کی بنا پر کوئی خاندان یا کوئی ایک طاقتور فرد تخت خلافت پر قابض ہو جائے ' تو اس صورت میں از روئے شرع مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے ؟ اگر وہ اہل نہیں ہے ' شرائط خلافت اسمیں نہیں پائے جاتے - یا ظالم و جابر ہے ' تو اس صورت میں کیا طرز عمل اختیار کیا جائے ؟ اسکی اطاعت کرنی چاہیے ' یا اس پر خروج کرنا چاہیے ؟ وہ شرعاً خلیفہ المسلمین ہو سکتا ہے یا نہیں ؟ اسکی ماتحت وہ تمام کام انجام پاسکتے ہیں یا نہیں جو از روئے شرع خلیفہ اسلام کی موجودگی پر موقوف ہیں ؟ اسکو زکوٰۃ دینی چاہیے ؟ اسکی پیچھے جمعہ پڑھنا چاہیے ؟ اسکی تمام احکام کی اطاعت کرنی چاہیے ؟

یہ مسئلہ امت کی اجتماعی زندگی کا بنیادی مسئلہ تھا ' اور ممکن نہ تھا کہ شریعت اسکی پوری پوری تشریح و توضیح سے خاموش رہتی - اس بارے میں نصوص سنۃ بے شمار اور بالکل واضح ہیں - اسی لیے جب خلافت راشدہ کے بعد بنو امیہ کی حکومت ظلم و جبر کے ساتھ قائم ہوئی ' تو صحابہ کرام کو اپنے طرز عمل کے فیصلے میں ذرا بھی تامل و تذبذب نہ ہوا - بالکل اس شخص کی طرح جو پہلے سے ایک خاص وقت کا سمجھا ہوا منتظر ہو ' فوراً یکسوئی کے ساتھ فیصلہ کر لیا - جو کچھ انہوں نے بتلایا اور کیا ' اسی پر اجماع امت کی مہر لگ گئی ' اور تیرہ سو برس سے جمہور اہل اسلام کا رہی متفقہ اعتقاد و عمل قرار پایا - بلاشبہ پہلی صورت میں بعض اسلامی فرقوں کو اختلاف ہوا ' مگر اس بارے میں سب متفق ہو گئے -

پہلی صورت میں شریعت نے اہلیت و صلاحیت کے وہ تمام شرائط اپنے انتہائی اور کامل مرتبہ میں قرار دیے ہیں جو ایک ایسے مرکزی اور اہم ترین منصب کیلئے قدرتی طور پر ہونا چاہئیں۔ کیا باعتبار قوت علمی کے - اور کیا بہ لحاظ قوت عملی کے - اور چونکہ یہ منصب متعدد حیثیتوں سے مرکب ہے، اسلئے ہر حیثیت کے لحاظ سے ضروری اوصاف بتلائے گئے۔ مثلاً اسلام، علم، نظر، عمل و تقویٰ، شجاعت و صولۃ، عدالت و ایثار، قدرت و نفوذ، طاقت و شرکت - چنانچہ عام کتب عقائد میں صدیوں سے مسلمان پڑھتے پڑھاتے آئے ہیں: ”ریشترط ان یکون من اہل الولاية المطلقة الكاملة بان یکون مسلماً، حرراً، ذکراً، عاقلاً، بالغاً، سائساً بقوۃ رائہ و رایتہ، و معونۃ باسہ و شرکتہ، قادراً بعلمہ و عدالتہ و کفایتہ و شجاعتہ علی تنفيذ الاحکام، و حفظ حدود الاسلام، و انصاف المظلوم من الظالم عند حدوث المظالم“ الخ - (۱) کذا فی شرح المواقف، و النسفی، و التمهید، و شرح فقہ الاکبر للقاری، و شرح المقاصد - و من کتب المحدثین شرح عقیدہ ابن عقیل، و فتح الباری، و شرح منظومۃ الاداب، و خلاصہ ابن مفلح، و نیل الاوطار، و دبل المرام للشوکانی، وغیرہم۔

جس وقت تک خاندان عباسیہ کی خلافت باقی رہی، یعنی خلافت خاندان قریش و عرب میں رہی (سنہ ۶۳۰ھ مطابق سنہ ۱۲۴۳ع - تک) علماء اسلام کی ایک بڑی جماعت کا یہ خیال رہا کہ بہ موجب حدیث ”ان هذا الامر فی قریش“ خلیفہ کو قرشی ہونا چاہیے۔ یعنی اگر مسلمان خلیفہ مقرر کریں، تو جہاں آؤں بہت سی باتیں اسمیں ہونا چاہئیں، وہاں یہ بات بھی ہو کہ خاندان قریش میں سے ہو۔

(۱) یعنی ایسے شخص کو خلیفہ منتخب کرنا چاہیے جس میں حسب ذیل اوصاف پائے جائیں - مسلمان ہو، آزاد ہو، مرد ہو، عاقل و بالغ ہو، صاحب رائے و نظر ہو، تدبیر و انتظام کی پوری قوت رکھنا ہو، احکام شریعت کا محافظ ہو، انکے جاری و نافذ کرنے اور اسلامی ممالک کی حفاظت اور دشمنوں کی روک تھام کیلئے جسقدر علمی و عملی قوتوں کی ضرورت ہے، وہ سب اُس میں موجود ہوں - اتباع شریعت، عدل و انصاف، شجاعت و ہمت، شرکت و صولت، ساری صفاتیں ہونی چاہئیں۔

اسی طرح جماعت امامیہ اس طرف گئی کہ خلافت خاندان نبوت یعنی بنی فاطمہ کے مخصوص آئمہ اہل بیت میں رہنی چاہیے - اُنکے اعتقاد میں آنحضرت صلعہ کے بعد حضرت علی علیہ السلام کو خلیفہ ہونا چاہیے تھا - اور اُنکے بعد اُنکی نسل کے آئمہ عترت رضی اللہ عنہم کو -

زبدیہ اس طرف گئے کہ بنی فاطمہ یعنی تمام سادات مستحق خلافت ہیں - آئمہ عترت کی خصوصیت ضروری نہیں - اور شرطوں کے ساتھ صرف اس قدر کافی ہے کہ امام سید یعنی بنی فاطمہ میں سے ہو -

لیکن دوسری صورت (یعنی اگر نظام شرعی کی جگہ ملکی قبضہ و تسلط کی صورت پیدا ہو جائے) اور جمہور کو انتخاب و نصب کا موقع نہ ملے ، تو اس صورت میں از روئے شرع مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے ؟) سو اسکی نسبت چونکہ خود احادیث صحیحہ اور اجماع صحابہ و عترت بالکل صاف صاف موجود تھا ، اسیلئے بلا اختلاف یہ اسلامی اعتقاد قرار پایا کہ جب ایک مسلمان منصب خلافت پر قابض ہو جائے اور اسکی حکومت جم جائے ، تو ہر مسلمان پر از روئے شرع واجب ہے کہ اُسی کو خلیفہ اسلام تسلیم کرے - اُسی کے سامنے گردن اطاعت جھکا دے - بالکل اُسی طرح جیسے ایک اہل و مستحق خلیفہ کے آگے جھکنا چاہیے - اطاعت و اعانت کی وہ تمام باتیں جو منصب خلافت کے شرعی حقوق میں سے ہیں ، ایسے خلیفہ کو حاصل ہو جاتی ہیں - اُس سے روگردانی کسی مسلمان کیلئے جائز نہیں - اُسکے مقابلے میں خرچ اور دعوے کا حق کسی کو نہیں پہنچتا اگرچہ کیسا ہی افضل اور جامع الشرط ہو - جو کوئی ایسا کرے ، مسلمانوں پر واجب ہے کہ اُسکے مقابلے اور قتل میں خلیفہ کا ساتھ دیں - وہ شرعاً باغی ہے - اُسکو قتل کر دینا چاہیے -

شریعت نے دوسری صورت میں یہ حکم کیوں دیا ؟ اسکی علت و مصلحت اس قدر کھلی ہے کہ شرح و تفصیل کی حاجت نہیں - شریعت اور امت کا قائم و باقی رہنا خلافت کے وجود و قیام پر موقوف تھا - ساری بنائیں شاخ ہیں - جز یہی مقام و منصب ہے - پس اسکے لیے ایک نظام شرعی مقرر کیا گیا جو بہتر سے بہتر اور افضل و عادل نظام ہو سکتا تھا - یعنی اسلامی حکومت کی بنیاد جمہور اور شوری کے انتخاب پر رکھی - شخص نسل ، تسلط و اقتدار اور پادشاہی و ملوکی کو اس میں دخل نہیں - ساتھ ہی اس منصب کی اہلیت کیلئے تمام ضروری شرطیں اور صفاتیں

بتلادیں کہ اپنا خلیفہ بناؤ تو ایسے شخص کو بناؤ۔ ایسے کو نہ بناؤ جو اُسکی اہلیت نہ رکھتا ہو۔ پھر پورے زور کے ساتھ اسکا بھی اعلان کر دیا کہ لوگوں کو خود خلیفہ بننے اور امارت و سرداری حاصل کرنے کا خواہشمند نہ ہونا چاہیے۔ نہ دعویدار بنکر دوسروں سے لڑنا چاہیے۔ آنحضرتؐ ہمیشہ اس عہد پر لوگوں سے بیعت لیتے تھے کہ ” لا ینازع الا مراہلہ “ جس کام کا جو اہل ہوگا اسی پر وہ کام چھوڑ دینگے۔ دنیا اگر اس چھوڑنے سے جملہ پر عمل کرے تو ورے زمین کے سارے چھگڑے ختم ہوجائیں۔ امام بخاری نے کتاب الاحکام میں باب باندھا ہے ” ما ینکر من العرص علی الامارہ “ (۱) اور

(۱) حق یہ ہے کہ بقول علامہ ابن خلدون صحیح بخاری کی شرح و تفسیر کا قرض ابٹک امت کے ذمہ باقی ہے۔ بے شمار شرحوں اور حاشیوں کے بعد بھی ابٹک ابن خلدون کا قول ویسا ہی صحیح ہے، جیسا فتح الباری اور عینی وغیرہ سے پہلے تھا۔ اس کتاب کے عجائب و دقائق قیامت تک ختم نہونگے۔ ہر کتاب، ہر باب، ابواب کی ہر ترتیب، اور ہر عنوان و ترجمہ، اس فقیہ الارض و اعجوبۃ الدھر کی فقاہۃ ربانی کی ایک آیۃ باہرہ و حجتہ قاہرہ ہے۔ اسی مسئلہ خلافت کو سامنے لاؤ، اور دیکھو، کس دقت نظر کے ساتھ محض ترتیب ابواب ہی میں اسلام کا نظام شرعی واضح کر دیا ہے اور ساری مشکلات حل کر دی ہیں؟ سب سے پہلی بات یہ تھی کہ اسلام کا نظام مرکزیت اس بارے میں کیا ہے؟ تو پہلا باب ” اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم “ کا باندھا، اور ” من اطاع امیری فقد اطاعنی “ الخ کی روایت درج کر کے بتلا دیا کہ مرکز کتاب اللہ ہے، رسول ہے، اور پھر خلیفہ و امام ہے۔ ” اولو الامر “ خلیفہ کے سوا کوئی نہیں۔ اُسکی اطاعت (بشرطیکہ کوئی خلاف شرع حکم نہ ہو) مثل خدا و رسول کی اطاعت کے فرض ہے۔ پھر باب باندھا ” الا مرء من قریش “ اور اسمیں ابن جبیر والی روایت لائے ” ما اقاموا الدین “ جب تک قریش دین کے قائم رکھنے کی اہلیت رکھینگے، خلافت انہی میں رہیگی۔ اسطرح واضح کر دیا کہ ایک خاص مدت تک قرشی خلافت کی پہلے سے خبر دیدی گئی تھی، مگر خلیفہ کا قرشی ہونا کوئی شرط اصلی و تشریعی نہیں ہے۔ صرف پیشین گوئی اور ہونے والے واقعات کا بتلا دینا ہے جیسا کہ بے شمار معاملات کی نسبت خبریں دی گئی ہیں۔ اور پھر جو کچھ بھی ہے ” ما اقاموا الدین “ کے ساتھ مشروط ہے۔ اس کے بعد ایک نہایت ہی اہم اور دقیق نکتہ کی طرف مترجہ ہرے اور باب باندھا ” اجر من قضی

ابو موسیٰ کی روایت لائے ہیں جس میں آپؐ فرمایا : ” انا لا نولی هذا من سألہ “ ر لا من حرص علیہ “ جو شخص خود اس چیز کا طالب ہو یا اسکی حرص رکھتا ہو اسکو میں یہ کام سپرد نہ کرونگا - یعنی امت کو اپنا عملی نمونہ دکھلا دیا کہ جو دعویٰ دار خود خلافت کا سائل و حریص ہو اسکو خلافت کیلئے منتخب نہ کرر -

مسئلہ خلافت کا اصلی نظام شرعی یہ ہے - اگر یہ قائم ہو تو دنیا امن و سکون کی ہمیشہ بن جائے - لیکن چونکہ معلوم تھا کہ ابھی وہ وقت نہیں آیا - یہ نظام تیس برس سے زیادہ قائم رہنے والا نہیں اسلیئے شرع

[بقیہ نوٹ صفحہ ۳۶]

بالحکمۃ “ افسوس اس باب کے ربط و ترتیب کی اصلی علت لڑگ نہ سمجھے - منصب خلافت کے اثبات کے بعد یہ چیز سامنے آنی تھی کہ اعمال خلافت کی بنیاد کیا ہے ؟ اور اسکا طریق کس منہاج سے ماخوذ ہے ؟ امام صاحب واضح کرنا چاہتے ہیں کہ بنیاد اسکی طریق ” حکمت “ پر ہے - یعنی انبیاء کرام کے طریق تربیت اسم پر جو ” سنت “ کا اصلی اور وسیع مفہوم ہے ، اور قرآن حکیم کی اصطلاح میں ” حکمت “ سنۃ نبیؐ ہی کا دوسرا نام ہے - ترجمۃ باب میں اسپر قرآن سے دلیل بھی لائے : ومن لم یحکم بما انزل اللہ فارلک ہم الفاسقون - حکم و قضا ” ما انزل اللہ “ کے مطابق ہونا چاہیے - اگر خلاف ہو تو فسق ہے - ” ما انزل اللہ “ کتاب و سنۃ ہے : و یعلمہم الکتاب والحکمۃ - پس ثابت ہوا کہ اعمال خلافت کی بنیاد حکمت و منہاج نبویؐ پر ہونی چاہیے - اس بارے میں جو زیادہ واضح و مفصل احادیث تھیں ، چونکہ انہی شروط کے مطابق نہیں لی جاسکتی تھیں ، اور بنیاد استدلال کی صرف مرفوع ہی پر رکھتے ہیں ، اسلیئے آثار و موقوفات بھی نہیں لے سکتے تھے ، پس مشہور حدیث ” لا حسد الا فی الثنین “ الخ درج کر کے قضاء بالحکمۃ کی اہمیت و مطلوبیت واضح کر دی - جب یہ مقدمات طے ہو چکے ، تو اب دکھلانا تھا کہ اس مرکز کی اطاعت کس طرح امت پر فرض کر دی گئی ہے ؟ پس باب باندھا ” السمع و الطاعة للامام ما لم تکن معصیۃ “ امت کا سننا اور اطاعت کرنا امام کے حقوق میں سے ہے - بجز اس حکم کے کہ معصیت ہو - اسمیں وہ تمام حدیثیں لائے ہیں جن میں صریح حکم موجود ہے کہ خلیفہ اہل ہو با نا اہل ، جامع الشرط ہو یا فاقد

ر ملت کی حفاظت کیلئے ضروری تھا کہ نظام اصلی پر زور دینے کے ساتھ ان وقتوں کیلئے بھی صاف صاف احکام دیدیے جائیں، جب انتخاب و نصب خلافت کے بارے میں شریعت کا ٹھہرایا ہوا طریقہ باقی نہ رہے، اور جمہوری حکومت کی جگہ شخصی و استبدادی طریقہ قائم ہو جائے۔

ظاہر ہے کہ اس صورت میں درہی راہیں سامنے آتی ہیں۔ اگر ایسے لوگوں کی خلافت تسلیم کر لی جائے تو اس سے امت کی جمعیت، جان و مال کا امن، ممالک اسلامیہ کی حفاظت، احکام شرع کا اجراء، جماعت کا قیام و بقا، اور اسی طرح کے مصالح و فوائد حاصل ہوتے ہیں کیونکہ بلا کسی نزاع کے اسلامی حکومت قائم ہو جاتی ہے۔ مگر ساتھ ہی غیر مستحق کی خلافت اور غیر نظام شرعی کے قائم ہو جانے کی خرابیاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔

[بقیہ نرٹ صفحہ ۳۶]

الشرط، عادل ہو یا جابر، مکروہات کا حکم دے یا محبوبات کا، جب تک وہ مسلمان ہے۔ نماز قائم رکھتا ہے، اسکی اطاعت کرنی چاہیے۔ کسی مسلمان کیلئے اسکی اطاعت سے باہر ہونا جائز نہیں۔ اسکے بعد بالترتیب تین باب آتے ہیں۔ ”من لم یسأل الامارة أعانہ اللہ“ دوسرا ”من سأل الامارة وکل الیہا“ تیسرا ”ما یکرہ من الحرص علی الامارة“ حاصل ان تینوں عنوانوں کا یہ ہے کہ جہاں شارع نے امت کو خلیفہ و امام کی ضروری صفتیں اور شرطیں بتلا دی ہیں، وہاں اس سے بھی روک دیا ہے کہ کوئی شخص خود امامت و سرداری کا خواہاں ہو اور اسکے لیے کوشش کرے۔ حتیٰ کہ عبد الرحمن بن سمرہ سے کہا ”جو اہل اور احق ہو، اسی کا ساتھ دو۔ خود اپنے لیے خواہاں نہ ہو۔ اگرچہ اسکے لیے قسم توڑنی اور کفارہ بھی دینا پڑے“ پس ان تمام ابواب کی یکے بعد دیگرے ترتیب سے واضح ہو گیا کہ اس بارے میں نظام شرعی کی قدرتی ترتیب یہ ہے :

(۱) امت کیلئے حسب نص ”واری الامر منکم“ مرکز اجتماع و جماعت خلیفہ کا وجود ہے۔ اسکی اطاعت فرض ہے۔ (۲) خبر دیدی گئی تھی کہ جب تک عرب و قریش میں صلاحیت رہیگی، خلافت پر قابض رہینگے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ (۳) بنیاد معاملہ خلافت کی ”حکمت“ پر ہے۔ وہ حکمت کہ ”و یعلمہم الکتاب و الحکمة“ یہ

لیکن اگر ایسوں کی خلافت تسلیم نہ کی جائے، ان پر خرارج کرنے کی اجازت دیدی جائے، اور اطاعت امت کا مستحق صرف اہل اور جامع الشرط خلیفہ ہی قرار دیا جائے، تو پھر دائمی کشت و خون، جنگ و قتال، دعوؤں کا ٹکرنا، قوتوں کا تزلحم، ہمیشگی کی بد امنی، کبھی ختم نہ ہونے والی طوائف الملرکی اور انارکی، امت کی تباہی، ملکوں کی خرابی، نظام جماعت کا اختلال، احکام شرع کی تعطیل، مسلمانوں کے جان و مال سے امن کا اٹھہ جانا، دشمنان اسلام کا اس با ہمدگر کشمکش سے فائدہ اٹھانا، اور اسی طرح کی بے شمار ہلاکتوں اور بربادیوں کا پھیل جانا لازمی تھا۔ مگر ساتھ ہی اسکی امید بھی تھی کہ شاید ان بربادیوں کے بعد اصلی نظام خلافت قائم ہو جائے اور نا اہلوں کی جگہ کسی اہل اور ساری شرطیں رکھنے والے آدمی کو خلافت دلائی جاسکے۔ پہلی صورت میں مصلحت کا بقا و حصول، مگر خرابیوں کا امکان تھا۔ دوسری صورت میں خرابیوں کا وقوع، مگر مصالح کا امکان تھا۔ اسلام نے پہلی صورت اختیار کی، اور پرری قوت و اصرار کے ساتھ دوسری راہ مسدود کر دی۔ یعنی مصالح کے امکان پر انکے وقوع کو ترجیح دی۔

[بقیہ نوٹ صفحہ ۲۶]

” حکمت “ ہے۔ پس ضرور ہے کہ خلیفہ کے تمام کاموں کی بنیاد طریق سنۃ پر ہو۔ بدعت و احداث پر نہ ہو۔ یہی معنی منہاج نبوت کے ہیں۔ (۴) جب خلافت منعقد ہوگئی تو تمام امت پر اسکی اطاعت فرض ہے۔ فی ما احب و یکرہ، ما لم یؤمر بمعصیۃ (۵) امت کو چاہیے کہ احق و اہل کو منتخب کرے۔ لیکن مستحق کو نہ چاہیے کہ خون خلافت کی خواہش کرے۔ جس نے ایسا کیا، اللہ کے حضور شرمندگی پائیگا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جب لوگ خون خواہش نہ کریں گے، اور حق انتخاب جمہور کو ہے، تو کسی طرح کی بھی کشمکش نہوگی۔ نہ بہت سے دعویداروں میں باہم جھگڑا ہوگا۔ امن و سکون کے ساتھ یہ معاملہ انجام پا جائیگا۔

یہ تھا صحیح نظام شرعی، جسکے علم و فہم کیلئے صرف صحیح بخاری ہی کافی ہے، اور اسلام کی کونسی حقیقت ہے جسکے لیے صحیح بخاری کافی نہیں؟ لیکن افسوس کہ نظام شرعی قائم نہ رہا۔ مجلس شوریٰ کی جگہ میدان جنگ میں خلافت کا فیصلہ ہوا، اور محض تسلط و جبر سے دعویدار قابض ہونے لگے۔ چنانچہ پہلے ہی سے اسکی خبر دیدی گئی تھی۔

کیا دنیا میں ایک دماغ اور ایک عقل صحیح بھی ایسی مل سکتی ہے جو شریعت کے اس فیصلہ کو غلط بتلاے ؟ اللہ کی شریعت کا اصل اصول جلب مصالح اور دفع مفاسد ہے - یعنی ہمیشہ فرائد حاصل کرنا اور مفاسد کو دور کرنا - اور جب مصالح کے ساتھ مفاسد بھی جمع ہو جائیں تو جس راہ میں مصالح زیادہ ہوں اور خرابیاں کم، اُسکو اختیار کرنا - تمام احکام کا محور یہی اصل ہے - پس اگر پہلی راہ اختیار کی جاتی اور خلیفہ کی اطاعت کیلئے خلیفہ کا جامع الشرط اور بطریق صحیح منتخب ہونا شرط قرار دیدیا جاتا، تو اسکا کیا نتیجہ نکلتا ؟ نصب و انتخاب کیلئے نظام شرعی تو درہم ہو چکا تھا - ہر دماغ میں حرص و دعوا، اور ہر ہاتھ میں تلوار تھی - یہی نتیجہ نکلتا کہ ایک عام طوائف الملکی اور انارکی پھیل جاتی - ہر شخص یہ کہہ کر کہ خلیفہ اہل و مستحق نہیں ہے، بغارت کیلئے اُٹھ کھڑا ہوتا - تمام امت میں خون اور موت کی وبا پھیل جاتی - شہروں کا کوئی محافظ نہ رہتا - آبادیوں کا کوئی حاکم نہ ہوتا - نہ مجرموں کو کوئی سزا دینے والا، اور نہ ڈاکروں سے کوئی بچانے والا - زکوٰۃ کس کو دی جاتی ؟ جمعہ کون قائم رکھتا ؟ سرحدوں کی کون حفاظت کرتا ؟ باوجود اسلام کے اس صریح حکم اور مسلمانوں کے متفقہ اعتقاد کے، جو کچھ تاریخ اسلام کا حال رہا ہے، ظاہر ہے - مدعیان سلطنت کی باہمی پیکار اور جماعتوں کے باہمی نزاع نے کس طرح اسلامی فتوحات کی بڑھتی اور پھیلتی ہوئی قوت روک دی ؟ اور پھر جو کچھ حاصل ہو چکا تھا، اسکو بھی کھونا شروع کر دیا ؟ حتیٰ کہ جو قوم دنیا کی تمام قوموں کی وارث ہونے کیلئے اُئی تھی، دنیا کی چھوٹی سے چھوٹی قوم بھی اُسکی وارث بن گئی، اور اسلامی خلافت کے اجزاء حیات ثروت ثروت کر اور کت کت کر دنیا کی نئی نئی سلطنتوں اور ملکوں کیلئے سرسامان و مواد کا کام دینے لگے ! فَمَا كَانَ اللَّهُ لِيَظْلَمَهُمْ، وَلَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ !

(۳۹ : ۹)

(نصوص سنۃ و اجماع امت)

سب سے پہلے احادیث پر نظر ڈالنی چاہیے - اگر داعی اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نبوت کی صداقت کی آرزو کرئی دلیل نہ ہوتی، تو صرف یہی ایک بات بس کرتی تھی کہ اُنے والے واقعات کی تمام تفصیلات کس طرح اہل رزہ ہی بتلا دی گئی تھیں ؟ اور ایک ایک جزئی حالت کا کیسا کامل نقشہ صدیوں پہلے کھینچ دیا تھا ؟ یہ معاملہ اسقدر

یقینی اور ہر طرح کے شک و شبہ سے ماورا ہے کہ اگر دنیا اس پر یقین لانے کیلئے طیار نہیں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ دنیا کے پاس ماضی کی جس قدر معلومات موجود ہے ان میں سے کوئی بات بھی یقینی نہیں۔ نہ تو اس دنیا میں سکندر نامی کوئی پادشاہ کبھی گزرا، نہ روما نامی کوئی سلطنت قائم ہوئی، اور نہ ہم بیسویں صدی کے انسان اس کے لیے مجبور ہیں کہ نپولین کا وجود اور راتر لڑکی جنگ کا وقوع تسلیم کریں !

بہر حال احادیث کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام ہونے والے واقعات پیشتر سے معلوم تھے اور ہر حالت اور ہر وقت کیلئے صاف صاف حکم دیدیا گیا تھا۔ احادیث کے اس حصہ کا نہایت دقت نظر کے ساتھ مطالعہ کرنا چاہیے۔ ہر در کی خاص حالت ہے اور اسلئے خاص حکم۔ سب سے پہلے وہ حدیثیں سامنے آتی ہیں جن میں خلافت خاصہ و راشدہ کا ذکر کیا ہے، اور چونکہ یہ خلافت تھیک تھیک طریق نبوت و سنت پر قائم ہونے والی تھی، اسلئے امت کو وصیت کی ہے کہ نہ صرف انکی اطاعت کی جائے، بلکہ انکے تمام اجماعی باتوں اور کاموں کو مثل اعمال نبوت کے ”سنت“ سمجھا جائے اور اُسکی پوری طرح پیروی کی جائے۔

مشہور حدیث عرباض بن ساریہ ”قام فینا رسول اللہ صلعم ذات یوم“ فرعون موعظۃ بلوغۃ، رجلت منها القلوب، و ذرفت منها العیون۔ فقیل یا رسول اللہ ! وعظتنا موعظۃ مردع فاعهد الینا بعد۔ فقال علیکم بقرۃی اللہ، و السمع و الطاعہ و ان کان عبدأ جشیأ، و سترن من بعدی، اختلفاً شدیداً، فعلیکم بسنتی و سنتۃ الخلفاء الراشدین المہدیین۔ عضوا علیہا بالنواجذ“ (ابن ماجہ و ترمذی) اور حدیث ”خیر القرون قرنی“ ثم یلونہم ”الخ اور ”اما طبقتی و طبقۃ اصحابی فاهل علم و ایمان“ الخ رواہ البغوی عن انس۔ یعنی آنحضرت (صلعم) نے خطبہ دیا اور فرمایا۔ میں تم کو وصیت کرتا ہوں کہ اللہ سے ڈرو، اپنے امام کا حکم سنو اور مانو اگرچہ وہ ایک حبشی غلام ہو۔ اور دیکھو! میرے بعد بڑے سخت جھگڑے ہونے والے ہیں، پس چاہیے کہ فتنوں سے بچو اور ہمیشہ میری سنت اور میرے بعد کے جانشینوں کی سنت پر کاربند رہو، اور اسکو اس طرح مضبوطی سے پکڑ لو جیسے کوئی شخص دانٹوں سے کوئی چیز پکڑ لیتا ہے۔ اور فرمایا: بہتر زمانہ میرا ہے، پھر وہ جو میرے بعد کا ہے۔ اور فرمایا: میرا اور

میرے یاروں کا طبقہ علم اور ایمان کا طبقہ ہے - اسی طرح حضرت ابن مسعود کی حدیث ”ما من نبی بعثہ اللہ فی امتہ قبلی“ الا کان لہ حواریون واصحاب‘ یاخذون بسنتہ ویقتدون بامرہ“ الخ (مسلم) وغیر ذلک - غرضکہ اس پہلے دور کیلئے در حکم دیے گئے تھے - ایک اطاعت کا دوسرا اقتداء اور پیروی کا -

لیکن اسکے بعد وہ حدیثیں سامنے آتی ہیں جن میں خلافت کے دوسرے دور کا ذکر کیا گیا ہے - اس دور میں پہلا حکم تو بدستور باقی رہتا ہے، لیکن دوسرا حکم بالکل بدل جاتا ہے - یعنی امت کو اس دور کے خلفاء و سلاطین کی اطاعت کی تو ویسی ہی وصیت کی جاتی ہے، جیسے پہلے دور کیلئے کی تھی، لیکن انکے کاموں کی پیروی اور اقتداء کا حکم نہیں دیا جاتا، بلکہ بتدریج ترک و مخالفت کا حکم دیا جا رہا ہے - اس سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ اس دور میں جو لوگ خلافت پر قابض ہو جائیں گے، انکی خلافت شریعت کے مطلوبہ نظام پر نہ ہوگی، اور نہ انکا چلن قرآن و سنت کے مطابق ہوگا - ان میں اچھے بھی ہونگے - برے بھی ہونگے - اسلیئے امت کو اب صرف اطاعت کا اور انکی خلافت کے آگے سر جھکا دینے کا حکم دیا جا رہا ہے - انکے طور طریقوں کی پیروی اور انکے کاموں کو شرعی کام سمجھ لیں گے کہ حکم نہیں دیا جاتا - صاف صاف وصیت کی جاتی ہے کہ جب وہ لوگ برائیاں پھیلانیں، تو جس کی طاقت جہاں تک کام دے، برائیوں کے روکنے کی پوری کوشش کرے - ہاتھ سے کام لے - زبان کو حرکت میں لائے - یہ دونوں درجے نصیب نہ ہوں تو کم از کم دل ہی دل میں برائی کو برا سمجھے - ”وذلك اضعف الایمان“ - لیکن برے کاموں کو انکی عظمت کے دباؤ سے اچھا نہ سمجھ لے اور نہ انکا ساتھ دے - ”ولیس راء ذلک من الایمان حبة خردل“ (۱)

(۱) احادیث کا یہ حصہ نہایت اہم اور غور طلب ہے - مختلف

حدیثوں میں مختلف دوروں اور لوگوں کا ذکر ہے، اسلیئے احکام بھی مختلف ہیں - اس نکتہ پر جسکی نظر نہ گئی وہ احکام و علائم کو مختلف و متضاد دیکھ کر یا تو حیران ہوا - یا سخت غلطیوں میں مبتلا ہو گیا - عہد نبوی سے لیکر آخر تک مختلف دور آنے والے تھے - ہر دور کے خصائص و حالات دوسرے سے مختلف تھے - پس انکے احکام میں بھی اختلاف ہوا -

.....

عن عباده بن الصامت - قال ” بايعنا رسول الله صلعم على السمع والطاعة في منشطنا ومكرهنا وعسرنا ويسرنا وأثرة علينا “ وان لا ننازع الامر اهله ‘

[بقیہ نرٹ صفحہ ۴۲]

مشترکات و مختلفات کو الگ الگ کر دینا چاہیے - پھر ہر حدیث اور ہر حکم کو اُسکی جگہ دینی چاہیے - ایسا نہ کرنے سے لوگوں کو بڑی بڑی غلط فہمیاں ہوئیں - بہتر کر یہ لغزش ہوئی کہ ” اطاعت “ اور ” اقتداء “ کا فرق نہ سمجھ - جن حدیثوں میں ” اقتداء “ کی ممانعت بلکہ خلاف کرنے کا حکم پایا ، انکو ” منع اطاعت “ اور جواز خرچ پر محمول کر لیا - خوارج اور معتزلہ کے ایک گروہ کو یہی دھوکا ہوا - ایک دوسری جماعت نے یہ غلطی کی کہ حکم اطاعت کو عام مطلق سمجھ لیا ، اور منع اقتداء و تاسی اور رجوب امر بالمعروف نے جو تخصیص کر دی تھی ، وہ اُنکی سمجھ میں نہ آئی - یعنی اس دھوکے میں پڑ گئے کہ جب امراء و حکام کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے ، خواہ اُنکے اعمال کیسے ہی خراب ہوں ، تو پھر چاہیے کہ نہ کسی برائی پر توکیں ، نہ منکرات کے خلاف جد و جہد کریں - ہر حال میں چپ چاپ بیٹھکر اطاعت کرتے رہیں - یہ جو صدیقوں سے عام علماء اسلام نے اصحاب اقتدار کے خلاف امر بالمعروف یکظم ترک کر دیا ہے ، تو نفس خادع انکو بھی یہی دھوکا دے رہا ہے - بعض حدیثوں میں آیا ہے کہ اطاعت نہ کرنے میں فتنہ ہے - ان لوگوں نے چونکہ ” اطاعت “ اور ” اقتداء “ کا فرق نہیں سمجھا تھا ، اسلیے یہ مطلب سمجھ کہ پادشاہوں اور امیروں کو برائی پر توکنے اور اُنکے خلاف حق کے اعلان میں بڑی بڑی مصیبتیں جھیلنی پڑتی ہیں - یہی چیز فتنہ ہے - پس اس فتنہ سے بچنا چاہیے - نتیجہ یہ نکلا کہ حق و باطل میں کوئی تمیز باقی نہ رہی - تمام زبانیں گونگی اور - تمام دل مردہ ہو کر رہ گئے - حالانکہ دنوں جماعتوں نے تھوکر کھائی - دنوں نے حدیثوں کا صحیح مورد اور محل نہ سمجھا - ایک صورت یہ ہے کہ مسلمان کسی کو اپنا قومی پادشاہ مان لیں ، اور ایک پادشاہ کی جیسی فرماں برداری رعایا کو کرنی چاہیے ، تھیک تھیک ویسی ہی فرماں برداری کریں - کوئی بات ایسی نہ کریں جس سے ثابت ہو کہ اُسے اپنا حاکم نہیں سمجھتے - اسکا نام ” اطاعت “ ہے - دوسری صورت یہ ہے کہ کسی انسان کو دینی و اخلاقی اعتقاد و عمل میں اپنا پیشوا مان لیں ، اور راستی و حق پرستی کے اعتبار سے اُسکی زندگی کو اپنے لیے

الا ان تررا کفرا بواحا عندکم فیہ من اللہ برہان“ متفق علیہ - عبادہ بن الصامت کہتے ہیں - ہم سے رسول اللہ (صلعم) نے اس بات پر بیعت لی

[بقیہ نوت صفحہ ۱۴۲]

نمونہ بنا لینا ، اور اُسکے قدم بہ قدم چلنے کی کرشش کرنا - اسکا نام ” اقتداء “ اور ” تاسی “ ہے - دونوں صورتیں الگ الگ ہیں - بلاشبہ ” اطاعت “ ایک عام حالت ہے اور اسمیں ” اقتداء “ کی حالت بھی داخل ہے ، لیکن ” اقتداء “ اطاعت سے زیادہ خاص ہے ، اور ضروری نہیں کہ ہر اطاعت اقتداء بھی ہو - احادیث میں خلفاء راشدین کی نسبت امت کو ” اطاعت “ اور ” اقتداء “ دونوں کا حکم دیا گیا ، لیکن بعد کے خلفاء و سلاطین کو صرف ” اطاعت “ کا مستحق بتلایا - ” اقتداء “ کا نہیں - کیونکہ معلوم تھا کہ اُنکے کام اچھے نہ ہونگے - شریعت و عدالت سے منحرف ہو جائیں گے - اور چونکہ نظام جماعت کے قیام کے ساتھ احکام کتاب و سنت اور عدل و صداقت کی حفاظت کا انتظام بھی ضروری تھا ، اسلیے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض ہر حال میں باقی رہا - اور حکم دیا گیا کہ ایسے وقتوں میں سلطان اسلام کو اپنا امام مانکر پوری پوری اطاعت کرے ، لیکن پادشاہ کی اطاعت کے یہ معنی نہیں کہ سفید کو سیاہ ، اور دن کو رات مان لو - حق حق ہے - باطل باطل - برائی جب دیکھو ، تو کو - ظلم جب کیا جائے ، روکو - اس کام میں ایک پادشاہ اور ایک مزدور ، دونوں برابر ہیں - ” لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق “ قاعدہ کا یہ ہے ، اور توأصوا بالحق و توأصوا بالصبر حکم عام و مطلق - کسی مخلوق کی ایسی اطاعت نہیں کی جاسکتی جس میں خالق کے حکم سے نافرمانی کرنی پڑے - اور یہ جو جابجا کہا کہ اطاعت نہ کرنے میں فتنہ ہے - قویاد رہے کہ ” اطاعت “ نہ کرنے میں ، نہ کہ ” اقتداء “ نہ کرنے میں ، اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں - یعنی خلیفہ اسلام سے بغاوت نہ کرے - اسمیں جمعیت امت کیلیے بڑا ہی فتنہ ہے - یہ مطلب نہیں کہ برائی کی مخالفت اور حق کے اعلان میں فتنہ ہے - حق کا اعلان تو ہمیشہ اور ہر حال میں دنیا کیلیے نظم و امن ہے - وہ کبھی فتنہ نہیں ہو سکتا - اگر حق کی پکار فتنہ ہو جائے تو پھر نظام ہستی منقلب ہو جائے : و لو اتبع الحق أهوائهم لفسدت السموات و الارض و من فیہن ! (۲۳ : ۷۴)

کہ ہر حال اور ہر طرح کی زندگی میں امام کی اطاعت کرینگے - حکومت و سرداری کو اسکے کرنے والوں پر چھوڑ دینگے ، اور کبھی اس بارے میں کڑی جھگڑا نہیں کرینگے - الا یہ کہ بالکل کھلا کھلا کفر امام سے ظاہر ہو - ایسی بات میں جسکے لیے اللہ کی کتاب میں حکم و دلیل موجود ہے - سو اُسوقت کسی کی اطاعت بھی اللہ کی اطاعت سے نہ روک سکیگی - یعنی جب تک امام سے صریح کفر نہ سرزد ہو ، ہر حال میں اُسکی اطاعت واجب ہے -

”خيار ائمتکم الذین تحبونہم و یحبونکم و تصلون علیہم و یصلون علیکم“ و شرار ائمتکم الذین تبغضونہم و یبغضونکم“ و تلعنونہم و یلعنونکم“ قال قلنا - اَفَلَا نُنَاقِذُہُمْ عِنْدَ ذَٰلِكَ ؟ قال لا ، ما اقاموا فیکم الصلوۃ ، الا من ولی علیہ رال فَرَأَہُ شَیْئًا مِّنْ مَّعْصِیَةِ اللّٰہِ فَلِیْکَہُ مَا یَأْنِیْ مِنْ مَّعْصِیَةِ اللّٰہِ ، و لا یُذْرَعْنَ یَدَا مِنْ طَاعَۃٍ“ رواہ احمد و مسلم -

و عن حذیفۃ أَنّہ (صلعم) قال ” یشکون بعدي أئمة لا یتحدون بھدی ولا یستنون بسلّتی “ و سيقوم فیکم رجال قلوبہم قلوب الشیاطین فی جثمان انس - قال قلت - کیف اصنع یا رسول اللہ ان أدركت ذلک ؟ قال - تسمع و تطیع و ان ضرب ظہرک و اخذ مالک فاسمع و اطع“ رواہ مسلم و احمد -

یعنی فرمایا : تمہارے بہتر حاکم وہ ہیں کہ اُنکی محبت تمہارے دلوں میں ہو اور تمہاری انکے دلوں میں - تمہاری زبانوں سے اُنکے لیے رحمت کی صدا نکلے اور اُنکی زبانوں سے تمہارے لیے - اور بدترین حاکم وہ ہیں کہ تمہارے دلوں میں اُنکی دشمنی ہو ، اور وہ تمہیں دشمن سمجھتے ہوں - تم اُن پر لعنت بھیجو - وہ تم پر - صحابہ نے عرض کیا - یا رسول اللہ ! کیا ایسے حاکموں سے ہم نہ جھگڑیں ؟ فرمایا نہیں - جب تک وہ تم میں نماز قائم رکھیں - اُنکی اطاعت ہی کرو ! ہاں جو بات گناہ کی دیکھو اُسے پسند نہ کرو مگر امام کی طاعت سے ہاتھ نہ کھینچو - نیز فرمایا - میرے بعد ایسے امام ہونگے جو میرا طرز طریق چھوڑ دینگے - میری سنت پر نہیں چلیں گے - عنقریب تم پر ایسے لوگ حکمران ہونگے کہ اُنکا جسم تو انسانوں کا ہوگا مگر دل شیطان کا سا - راجی نے پوچھا - اگر ہم نے ایسا زمانہ پایا تو کیا کریں ؟ فرمایا - سنو اور اطاعت کرو - اگر وہ تمہاری پیٹھ پر تازیانے لگائیں اور تمہارا مال چھین لیں ، تب بھی اُنکی سنو اور اطاعت کرو !

”ستكون بعدي اثرۃ و امور تنکرونها“ قالوا - فما تأمرنا ؟ قال ”تؤدرون الحق الذی علیکم“ و تسألون اللہ الذی لکم“ متفق علیہ عن ابن مسعود ،

و اخرجہ ایضاً العرث بن رهب رأ رده الحافظ فی التلخیص ' ر عن جابر بن عتيك مرفوعاً عند ابي داؤد بلفظ " سيايتكم ركب مبغضون " فاذا أنتم فرحبوا بهم دخلوا بينهم و بين ما يبتغون- فان عدلوا فلا نفسهم ' ر ان ظلموا ' فعليها " ر عن وائل بن حجر- قال سمعت رسول الله صلعم ورجل يسأله - فقال - أرايت إن كان علينا امراء يمنعوننا حقنا ويسألونا حقهم ؟ قال " اسمعوا واطيعوا " فانما عليهم ما حملوا ' ر عليكم ما حملتم " (مسلم و الترمذي و صححه)

" على المرء المسلم السمع والطاعة فيما أحب وكره " الا ان يؤمر بمعصية ' فان امر بمعصية فلا سمع ولا طاعة " (شيخان وغيرهما عن ابن عمر)

سبکا خلاصہ دہی ہے جو اوپر گزر چکا - آخری روایت میں فرمایا - ایک مسلمان کا فرض ہے کہ خواہ گوارا ہو یا ناگوار ، مگر امام کا کہا سننے اور ماننے - ہاں اگر وہ ایسا حکم دے جسکی تعمیل میں گناہ ہو ، تو پھر اس حکم میں نہ تو سننا ہے اور نہ ماننا - کسی برے سے برے مخلوق کی خاطر دہی خدا سے نافرومانی نہیں کی جاسکتی - یہ اسلام کا ' اور دراصل تمام سچی تعلیموں اور سچے انسانوں کا عالمگیر قاعدہ کلیہ ہے -

اور دہی وجہ ہے کہ صدقات و زکوٰۃ وغیرہ مالیات کی ادائیگی کی نسبت حکم دیا گیا کہ اگرچہ وصول کرنے والے حکام ظالم و جابر ہوں ' یا بیت المال کا رویہ نا جائز طور پر خرچ کر رہے ہوں ' لیکن اگر امام کی طرف سے مامور ہیں تو انکی اطاعت کرنی چاہیے - جس شخص نے زکوٰۃ ایسے عامل کو دیدی ' اُسکی زکوٰۃ ادا ہوگئی - البتہ قوم کو کوشش کرنی چاہیے کہ ایسے عامل معزول کیے جائیں - لیکن جب تک معزول نہوں ' نظام شریعت کے قیام کیلئے ضروری ہے کہ انکے احکام کی تعمیل کی جائے - بشیر بن خصاصہ کی روایت میں ہے کہ لوگوں نے کہا " ان قوماً من اصحاب الصدقة یعتدون علینا " عمال صدقہ لینے میں ہم پر ظلم کرتے ہیں - کیا حق سے زیادہ نہ دینے میں انکا مقابلہ کریں ؟ فرمایا نہیں - (ابو داؤد) سعد بن رقاص کی روایت میں فرمایا " ادفعوا الیہم ما ملوا " ابن ابی شیبہ میں حضرت ابن عمر کی نسبت ہے کہ کسی نے کہا - زکوٰۃ کسے دیں ؟ کہا رقت کے حاکموں کو - سائل نے کہا " اذا یلتخذون بها ثياباً و طیباً " وہ تو زکوٰۃ کا رویہ اپنے کپڑوں اور زینت میں خرچ کرتے ہیں - فرمایا " ر ان " اگرچہ ایسا کرتے ہوں مگر زکوٰۃ حاکم ہی کو دے - اسی بنا پر محدثین نے باب باندھا " برأۃ رب المال بالدفع الی السلطان مع العدل

و البحر“ اور اسی لیے جمہور فقہا کا یہی مذہب قرار پایا کہ اگر حکام جزیر کو زکوٰۃ دی گئی تو ادا ہو گئی۔ ائمہ اہل بیت و عترۃ نے بھی قولاً و فعلاً اس سے اتفاق کیا جیسا کہ حضرت امام باقر (علیہ و علی آبائہ السلام) سے اصول میں منقول ہے۔ اور اسی لیے محققین امامیہ و فقہاء زیدیہ بھی اس فیصلہ میں جمہور کے ساتھ ہیں۔

(اذا بریع الخلیفتین فاقتلوا اخرهما)

اگر ایک خلیفہ کی حکومت جم چکی ہے اور قائم ہے اور دوسرا مدعی کہتا ہو، تو اسکا حکم یہ ہے کہ وہ باغی ہے۔ فرمایا اُسے قتل کرو۔ اُسکی زندگی تمام اُمت کے نظم و امن کیلئے فتنہ ہے۔ وہ اُمت میں پھرتا ڈالنا اور جمے ہوئے انتظام کو دھم دھم کرنا چاہتا ہے۔ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ - عن عروجة الاشجعي - قال سمعت صلعم يقول ” من أتاكم و امرکم جمیع علی رجل واحد، یرید ان یشق عصاکم أریفرق جماعتکم، فاقتلوه“ (احمد و مسلم)

اسی لیے جمہور اہل اسلام نے اتفاق کیا کہ خلیفہ خواہ اہل ہو یا نا اہل، لیکن اگر اسکی حکومت قائم ہے تو جو اُس پر خروج کرے، اُسکا حکم باغی کا حکم ہے۔ اُس سے لڑنا اور اُسکی جماعت کو قتل کرنا جائز ہے بشرطیکہ تبلیغ و دعوت اور دفع شکوک کے بعد بھی باز نہ آئے۔ ایک گروہ نے کہا کہ نہ صرف جائز بلکہ بحکم فقاتلوا التي تبغي (۹: ۳۹) واجب ہے۔ ”رقد حکمی فی البحر عن العترة جمیعاً ان جهادهم افضل من جهاد الکفار الی دیارهم“ ان فعلهم فی دالار الاسلام کفعل الفاحشة فی المسجد“ (ذیل الاوطار۔ جلد ۷ صفحہ ۸۰) یعنی تمام ائمہ اہل بیت و عترۃ سے منقول ہے کہ ایسے باغیوں سے جہاد کرنا کفار پر حملہ کرنے سے بھی افضل ہے۔

(اجماع اُمت و جمہور فقہاء و اعلام)

بذو اُمیہ کے امراء کی حکومت ظلم و بدعت کے ساتھ قائم ہوئی اور اسوقت ایک جم غفیر صحابہ کرام و ائمہ اہل بیت نبوت کا مرجع تھا۔ عہد عباسیہ کی پوری پانچ صدیاں گزر گئیں، اور یہی زمانہ تمام علوم شرعیہ کی تدریس و ترتیب کا تھا۔ تمام ائمہ و اعلام اور فقہاء مذاہب اسی عہد میں پیدا ہوئے اور عقائد و مسائل نے آخری ترتیب و تنظیم پائی۔ لیکن ان تمام عہدوں میں سب کا اتفاق اسی بات پر رہا جو ارپر گزر چکی۔ عقائد ضروریہ اور ارکان اربعہ کے بعد شاید ہی کسی اسلامی اعتقاد پر اس درجہ محکم

و یقینی اجماع و تعامل ثابت کیا جاسکے - صحابہ کا حال معلوم ہے - مروان مدینہ کا گورنر تھا اور حضرت ابو ہریرہؓ مسجد نبوی میں مروان کی عبادت سے بد ذوقی کا یہ حال تھا کہ سورہ فاتحہ کے بعد آمین کہنا اور مقتدیوں کو شرکت کا موقعہ دینا بھی اسکی جلد بازی پر شاق گزرتا تھا - ابو ہریرہؓ اس سے وعدہ لے لیتے ” لا تغننی ہا میں “ قرأت میں ایسی جلدی نہ مچائیو کہ میری آمین ضائع جائے ، لیکن نماز اسی کے پیچھے بڑھتے اور اسکی اطاعت سے انکار نہ کرتے - اس سے بڑھکر یہ کہ امراء بنو امیہ علانید ظلم و ستم کرتے تھے - بدعات کا یہ حال تھا کہ جس سنت کو چاہتے ، اپنی ہوا نفس سے بدل دیتے - لوگ انکی بارہ گوئی سننا پسند نہیں کرتے تھے - عید کے دن خطبہ دیتے تو لوگ اٹھکر چلے جاتے کہ خطبہ عید کی سماعت واجب نہیں - یہ حال دیکھکر مروان نے چاہا - عید کے دن نماز سے پہلے خطبہ دیدے تاکہ نماز کے انتظار کی وجہ سے مجبوراً لوگوں کو خطبہ سننا پڑے - حالانکہ یہ صریح سنت مستمرہ و اجماعی کے خلاف تھا - حضرت ابوسعید خدریؓ نے بلا تامل اسپر ٹوکا - ایسی بے شمار باتیں کی جاتی تھیں - صحابہ کرام نہایت بے باکی سے امر بالمعروف کا فرض ادا کرتے اور ہمیشہ ٹوکتے - لیکن خلیفہ انہی کو مانتے اور اطاعت انہی کی کرتے - کسی صحابی نے بھی اطاعت سے پہلے اسکی جستجو نہ کی کہ خلیفہ میں ساری شرطیں خلافت کی پائی جاتی ہیں یا نہیں ؟ اگر اسکی جستجو کرتے تو سب سے پہلی شرط یعنی بطریق انتخاب شرعی و شوریٰ منتخب ہونا ہی مفقود تھا - باقی شرطیں تو سب اسکے بعد کے دیکھنے اور جانچنے کی ہیں - حضرت سید التابعین سعید بن المسیبؓ کہا کرتے - بنی مروان انسانوں کو بھوکا مارتے ہیں اور کتوں کو کھلاتے ہیں (۱) اور پھر انکے ہاتھوں ہر طرح کے مظالم و شائد بھی سہتے ، مگر ساتھ ہی بہ حیثیت سلطان اسلام کے انہی کی اطاعت بھی کرتے - ماموں و معتصم کے عہد میں علماء سنۃ پر جو جو مظالم و شائد ہوئے ، معلوم ہیں - حضرت امام احمد بن حنبلؓ نے اسی کورسوں کی ضرب اور برسوں تک قید خانے میں رہنا گوارا کر لیا لیکن ماموں و معتصم کی دعوت بدعت کی پیروی نہ کی - با ایں ہمہ اطاعت کا مستحق انہی کو سمجھا ، اور اپنے نامۃ رصیۃ میں یہی لکھا ” و الدعاء لائمة المسلمین بالصلاح “ و لا تخرج علیہم بالسیف “ و لا تقاتل ہم فی الغنہ “ کذا نقل عنہ ابن الجوزی فی سیرتہ -

اسی طرح تمام آئمہ اہلبیت کا زمانہ خلفاء بنو امیہ و عباسیہ کے عہدوں میں گزرا - یہ معلوم ہے کہ وہ خلافت کا مستحق صرف اپنے ہی کو یقین کرتے تھے نہ کہ بنو امیہ و عباسیہ کو - با ایں ہمہ کسی نے بھی انکے خلاف خروج نہ کیا اور نہ اطاعت سے انکار کیا - سب اسی پر متفق ہوئے کہ حکومت انکی قائم ہو چکی ہے ، اسیے سلطان رقت رہی ہیں - خاندان اہل بیت میں سے جس کسی نے خروج کیا ، آئمہ نے برابر اپنی مخالفت اُن سے ظاہر کی - جیسا کہ حضرة زید کے واقعہ اور امام جعفر صادق علیہ السلام کے انکار سے ثابت و معلوم ہے - حضرة امام علی رضا کو مامور الرشید نے اپنا ولی عہد قرار دیا - امام موصوف نے ولی عہدی قبول کر لی - یعنی تسلیم کر لیا کہ مامور خلیفہ ہے ، اور اُسکو اپنے استخلاف اور ولی عہدی کا حق پہنچتا ہے - اگر وہ خود خلیفہ نہ تھا تو دوسرے کو ولی عہدی کیونکر مل سکتی تھی ؟ آئمہ اہل بیت کی پوری تاریخ میں ایک واقعہ بھی موجود نہیں کہ انہوں نے لوگوں کو بنو امیہ و عباسیہ کی اطاعت سے روکا ہو - بلکہ برخلاف اسکے کتب حدیث امامیہ (مثلاً اصول کافی وغیرہ) میں بے شمار تصریحات موجود ہیں کہ باوجود اظہار استحقاق خود ، و شکوہ غصب و تعدی ، عدم اطاعت و خروج سے ہمیشہ مائع رہے -

(سنی اور شیعہ دونوں متفق ہیں)

یہیں سے یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ حضرات امامیہ اور اہل سنت میں مسئلہ خلافت کی نسبت جو مشہور اختلاف ہے ، وہ پہلی صورت میں ہے ، نہ کہ دوسری صورت میں - یعنی اس بارے میں ہے کہ اگر امت خلیفہ و امام منتخب کرے تو کس کو اور کیسے کو منتخب کرے ؟ شیعہ کہتے ہیں کہ اسکا استحقاق صرف آئمہ اہل بیت کو ہے - وہی امام ہو سکتے ہیں - اہل سنت کہتے ہیں کہ یہ شرط ضروری نہیں - لیکن اگر اصلی نظام باقی نہ رہا ہو اور غلبہ و تسلط سے کوئی شخص اور خاندان اسلام کی مرکزی سلطنت پر قابض ہو گیا ہو ، تو اُسکی اطاعت پر جس طرح اہل سنت کی تمام جماعتیں متفق ہیں ، تھیک اُسی طرح شیعہ بھی متفق ہیں - اہل سنت کے نزدیک خلافت کی تمام شرطیں صرف خلفاء راشدین ہی میں جمع تھیں اور اُنکا انتخاب صحیح نظام شرعی کے مطابق ہوا تھا - اُنکے بعد پھر نہ ہوا - امامیہ کے نزدیک ابتدا ہی سے نہ ہوا - لیکن اطاعت دونوں عہدوں میں اہل سنت نے بھی ضروری قرار دی - شیعہوں نے بھی ضروری قرار دی -

نتیجہ یہ نکلا کہ ایک قائم و نافذ اسلامی سلطنت کی اطاعت پر سنی و شیعہ دونوں متفق ہیں۔ یہی حال زیدیہ وغیرہ فرقوں کا ہے اور بجز خوارج کے کسی اسلامی فرقہ کو اس سے اختلاف نہیں۔

(بعض کتب مشہورہ عقائد و فقہ)

بہتر ہوگا کہ اس مرقعہ پر چند مشہور کتب عقائد اور فقہ و حدیث کے اقوال بھی نقل کر دیے جائیں، تاکہ جو لوگ علوم شرعیہ سے ناواقف ہیں، انکو معلوم ہو جائے کہ یہ بات مسلمانوں کے عقائد کی ایک مانی ہوئی بات ہے اور تمام اسلامی مدرسوں میں صدیوں سے پڑھی پڑھائی جا رہی ہے۔ شرح مقاصد میں ہے: ”و اما اذا لم يوجد من يصلح ذالك“ اور لم یقتدر علی نصبہ لاسیلا اهل الباطل و شوكة الظلمه و ارباب الضلال“ فلا کلام فی جواز تقلید القضاء و تنفيذ الاحکام و اقامة الحدود و جمیع ما يتعلق بالامام من کل ذی شوكة“ اور شروط امامة بیان کر کے لکھتے ہیں ”نعم“ اذا لم یقتدر علی اعتبار الشرائط“ جاز الابتداء للاحكام المتعلقة بالامام“ علی کل ذی شوكة تغلب او استولي“ اور اسی میں ہے ”فان لم يوجد من قریش من یجمع الصفات المعتمدة“ ولی کفائی“ فان لم یوجد“ فرجل من ولد اسماعیل“ فان لم یوجد فرجل من العجم“۔

مرقات شرح مشکوٰۃ میں ہے ”و اما الخروج علیہم وقتالہم“ فمحرم و ان كانوا فسقة ظالمین“ اور حدیث ”من اتاكم و امرکم جمیع علی رجل واحد“ کی شرح میں لکھتے ہیں ”ای له اہلیۃ الخلفۃ“ او التسلط و الغلبہ“۔

شامی میں ہے ”و یتثبت عقد الامامة اما باستخلاف الخليفة اياه كما فعل ابو بكر“ و اما ببیعة جماعة من العلماء او من اهل الراے“۔

مسامرة میں ہے ”و المتغلب تصح منه هذه الامور (ای ولاية القضاء و الامارة و الحكم بالاستفتاء و نحوها) للضرورة“ و صار الحال عند التغلب كما لم یوجد قرشي عدل“ اور وجد و لم یقتدر (ای لم توجد قدرة علی تولیته لغلبة الجورة) اذ یحكم فی كل من الصورتین بصحة ولاية من لیس بقرشي و من لیس بعدل للضرورة“۔

اور شرح مواقف میں امامت کی شرطیں بیان کر کے لکھتے ہیں: لکن، لامنة ان ینصبوا فاقد ها، نفعاً للمفسد التي تندفع بنصبه“ (۶۱۴)

سب سے زیادہ مشرح بحث حافظ عسقلانی نے فتح الباری میں کی ہے ” وقد اجمع الفقهاء على وجوب طاعة السلطان المتغلب والجهاد معه “ ان طاعته خیر من الخروج علیه لما فی ذلك من حقن الدماء وتسكين الدھماء “ ولم یستثنوا من ذلك الا اذا رقع من السلطان الكفر الصریح فلا یجوز طاعته فی ذلك بل تجب معاهدته لمن قدر علیها كما فی الحدیث “ (جلد : ۲۱۲)

حافظ نزاری شرح مسلم میں لکھتے ہیں ” وهذه الاحادیث فی البحث على السمع والطاعة فی جمیع الاحوال “ و سببهما اجتماع كلمة المسلمين “ فان الخلاف سبب لفساد احوالهم فی دینهم و دنیاہم - و قوله صلعم : و ان كان عبد امجدع الاطراف - یعنی مقطوعا “ و المراد اخس العبيد - اے اسمع و اطیع للامیر و ان كان ذنبی الذنب * * * * * و یتصور امارۃ العبد ان رآه بعض الائمة “ او یغلب علی البلاد بشركته “ الخ - (جلد ۲ : ۱۲۵)

اور قاضی شوکانی در البیہ میں لکھتے ہیں ” و طاعة الائمة واجبة الا فی معصية الله “ و لا یجوز الخروج علیہم ما اقاموا الصلوة “ (شرح درر : ۴۱۴) اور حجة الله البالغة میں ہے ” ان الخلیفة اذا انعقدت خلافته “ ثم خرج آخر ینازعه “ حل قتله “

اور ازالۃ الخفاء میں ایک مفصل اور دقیق بحث مسئلۃ خلافت و حقیقت خلافت پر کرتے ہوئے (جس سے بہتر اور جامع بحث شاید ہی کسی دوسری جگہ مل سکے) لکھتے ہیں ” و حرام ست خروج بر سلطان بعد ازان کہ مسلمین بررے جمع شدند “ مگر آنکہ کفر بواج از رے دیدہ شود “ اگرچہ آن سلطان مستجمع شرائط نہ باشد و این مضمون متواتر بالمعنی سے “ (جلد - ۱ : ۱۳۷)

حاصل ان تمام عبارتوں کا وہی ہے جو اوپر گزر چکا - یعنی ہر زمانے میں امت کیلئے ایک خلیفہ ہونا چاہیے جو صاحب طاقت و اقتدار ہو - اگر امت منتخب کرے تو اسکے لیے فلاں فلاں شرطیں ہیں - لیکن اگر کسی مسلمان کی حکومت قائم ہوگئی ہے اور وہی صاحب اقتدار و شوکت ہے تو اُسکی کو خلیفہ ماننا چاہیے - خواہ تمام شرطیں اُس میں پائی جائیں یا نہ پائی جائیں ، اور اُسکی اطاعت و حمایت ہر مسلمان پر واجب ہے -

(من حمل علینا السلاح فلیس منا)

بخاری و مسلم میں ہے ” من حمل علینا السلاح فلیس منا “ (راہ ابن عمرؓ و سلمہؓ و ابو موسیٰ اشعریؓ - و فی روایت سلمہؓ ” من سل علینا السیف “) یعنی جس مسلمان نے مسلمانوں کے مقابلے میں ہتھیار اٹھایا (کفار کے ساتھ ہو کر) یعنی حملہ کیا یا لڑائی کی ، وہ مسلمانوں میں سے نہیں ہے ۔

یہ حدیث نہایت اہم ہے ، اور من حملہ قواعد و کلیات کے ہے ۔ اسی لیے امام مسلم کتاب الایمان میں لائے تاکہ حقیقت ایمان و کفر کی تحقیق میں اس سے مدد لیں ، اور حافظ نوارہ نے ایک مستقل عنوان قرار دیکر باب باندھا ۔

آنحضرتؐ صلعم کے طرز تکلم و خطاب پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ” لیس منا “ اور ” لیس مذی “ وعید کا ایک ایسا جملہ تھا جو ان موقوفوں پر آپ استعمال فرماتے ، جہاں صریح و قطعی کفر کی جگہ کفر سے کوئی بہت ہی قریب اور اسلامی زندگی سے بہت ہی بعید حالت کا بتلانا مقصود ہوتا تھا ۔ عام معاصی و فسوق سے یہ حالت زیادہ سخت مگر کفر قطعی سے کم ہوتی تھی ۔ جن جن احادیث میں یہ لفظ آیا ہے ، ان سب پر غور کیا جائے ، اور ایمان و کفر کے عملی مراتب کی حقیقت بھی پیش نظر ہو ، تو یہ بات واضح ہو جائیگی ۔ صاحب شریعت نے جن کاموں کیلئے جو احکام دیے اور جو الفاظ استعمال کیے ، ہمیں حق نہیں ہے کہ تاویل و توجیہ کر کے ان کے لغوی مفہوم کا اصلی زور اثر گھٹانے کی کوشش کریں ۔ ایسی کوششیں جن لوگوں نے کیں ، انہوں نے مسلمانوں کو اسلام و ایمان کی عملی زندگی سے محروم کر دیا (۱) ۔ ” لیس منا “ کے صاف معنی یہ ہیں کہ ” وہ ہم میں سے نہیں “ یعنی مسلمانوں میں سے نہیں ۔ اس سے ثابت ہوا کہ مسلمانوں کی کسی جماعت پر بطور جنگ و قتال کے ہتھیار اٹھانا جبکہ وہ غیر مسلمانوں سے لڑ رہے ہوں ، ایک ایسا فعل ہے جسکے کرنے کے بعد انسان مسلمانوں میں شمار ہونے کے قابل نہیں رہتا ۔ مسلمانوں

(۱) قال النوارہ ” ر کان سفیان بن عیینہ یکرہ قول من یفسرہ بلیس

منا بلیس علی ہدینا ، و یقول بئس هذا القول - یعنی بل یمسک عن تاریلہ “

(شرح مسلم مطبوعہ احمدی - صفحہ ۶۹)

نہی جماعت سے خارج ہو جاتا ہے ۔ لوگوں کا خواہ کچھ ہی قیاس ہو ،
لیکن اللہ کے رسول کا صریح فیصلہ یہی ہے ، اور قرآن و سنت کے تمام
احکام اسی کی تائید میں ہیں ۔

(رافعہ امام حسین علیہ السلام)

بعض لوگوں کو یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ اگر سلطان اسلام کو خلیفہ مان لینا
چاہیے گو نا اہل ہو ، تو پھر حضرت امام حسین علیہ السلام نے یزید بن
معاویہ کی حکومت کے خلاف کیوں خرچ کیا ؟ اور کیوں انکو برسر حق
اور شہید ظلم و جور تسلیم کیا جاتا ہے ؟

پس گور بحث کے اس حصے کا طول بقیہ مطالب کی تشریح میں
مخل ہو رہا ہے ، لیکن چونکہ اس معاملہ میں عام طور پر ایک سخت
غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے ، اسلیے صاف کر دینا ضروری ہے ۔ یہ
بالکل غلط ہے کہ حضرت امام حسین اُس حالت میں لڑے ، جبکہ وہ یزید کی
حکومت کے مقابلے میں خود مدعی امامت اور طالب خلافت تھے ۔
جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں ، انہوں نے رافعہؑ کربلا کا وقت نظر کے ساتھ
مطالعہ نہیں کیا ۔ حالات میں اچانک ایسی تبدیلیاں ہوئی
ہیں کہ اس غلط فہمی کا پیدا ہو جانا عجیب نہیں ۔ حضرت امام جب
مدینہ سے چلے ، تو انکی حیثیت دوسری تھی ۔ جب کربلا میں
حق پرستانہ لڑکر شہید ہوئے ، تو انکی حیثیت دوسری تھی ۔ دونوں
حالات مختلف ہیں ۔ دونوں کا حکم شرعاً مختلف ۔ جب وہ مدینہ سے
چلے ہیں تو حالت یہ تھی کہ نہ تو ابھی یزید کی حکومت قائم ہوئی تھی ۔
نہ اہم مقامات و مراکز نے اسکو خلیفہ تسلیم کیا تھا ۔ ابتدا سے معاملہ
خلافت میں سب سے پہلی آواز اور قوت انعقاد اہل مدینہ کی رہی ہے ،
پھر حضرت علی کے زمانے میں مدینہ کی جگہ کوفہ دار الخلافہ بنا ۔ لیکن
اہل مدینہ اسوقت تک متفق نہیں ہوئے تھے ۔ اور کوفہ کا یہ حال تھا کہ
تمام مخلوق یکقلم مخالف اور حضرت امام حسین سے بیعت کرنے
کیلئے پدیم اصرار و العلاج کر رہی تھی ۔ انہوں نے خود خلافت کی حرص
نہ کی ، بلکہ ایک ایسے زمانے میں جب تخت حکومت سابق حکمران سے
خالی ہو چکا تھا اور نئے کی حکومت ابھی قائم نہیں ہوئی تھی ، ایک بہت
بڑی مرکزی و موثر آبادی (یعنی کوفہ و عراق) کے طلب و سوال کو منظور
کر لیا ۔ البتہ اس منظوری میں یہ مصلحت بھی ضرور پدش نظر تھی کہ

یزید جیسے نا اہل کی حکومت سے اُمت کو بچایا جائے - لیکن جب وہ کوفہ پہنچے ، تو یکایک نظر آیا کہ حالت بالکل بدل چکی ہے - تمام اہل کوفہ ابن زبائ کے ہاتھ پر یزید کیلئے بیعت کرچکے ہیں ، اور سرزمین عراق کی وہ بے وفائی و غداری جو حضرت امیر کے عہد میں بارہا ظاہر ہوچکی تھی ، بدستور کام کر رہی ہے - یہ حال دیکھ کر معاملہ خلافت سے وہ بالکل دست بردار ہوگئے ، اور فیصلہ کر لیا کہ مدینہ واپس چلے جائیں - لیکن ابن سعد کی فوج نے ظالمانہ محاصرہ کر لیا اور مرغ اہل و عیال کے قید کرنا چاہا - وہ اس پر بھی آمادہ ہوگئے کہ مدینہ کی جگہ دمشق جائیں اور براہ راست یزید سے اپنے معاملے کا فیصلہ کرائیں ، مگر ظالموں نے یہ بھی منظور نہ کیا -

اب امام کے سامنے صرف دو راہیں تھیں - یا اپنے تئیں مع اہل و عیال قید کرا دیں - یا مردانہ وار لڑ کر شہید ہوں - شریعت نے کسی مسلمان کو مجبور نہیں کیا ہے کہ ناحق ظالموں کے ہاتھ اپنے تئیں قید کرا دے - انہوں نے دوسری راہ کمال عظیمہ دعوت کی اختیار کی ، اور خود فرشانہ لڑ کر حالت مظلومی و مجبوری میں شہید ہوئے - پس جس وقت کربلا میں میدان جنگ گرم ہوا ہے ، اُسوقت حضرت امام حسین مدعی خلافت و امامت نہ تھے - نہ اس حیثیت سے لڑ رہے تھے - اُنکی حیثیت محض ایک مقدس اور پاک مظلوم کی تھی جسکو ظالموں کی فوج ناحق گرفتار کرنا چاہتی ہے - وہ اپنے آپکو زندہ گرفتار کرا دینا پسند نہیں کرتا ، اور طاقتور ظلم کے مقابلے میں حق کی بے سرومان استقامت کا ایک یادگار منظر دنیا کو دکھلا دینا چاہتا ہے - تعجب ہے کہ یہ غلط فہمی صدیوں سے پھیلی ہوئی ہے - جسکو مغفل اور محققانہ بحث دیکھنی ہو ، وہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی منہاج السنہ جلد ۲ - کا مطالعہ کرے -

(شرط قرشیۃ)

مندرجہ بالا فصول سے یہ بات راضح ہوگئی کہ انتخاب خلیفہ و امام کیلئے متعدد شرطیں ہیں - از انجملہ ایک عرصہ تک علماء کی رائے رہی کہ خلیفہ کو خاندان قریش میں سے ہونا چاہیے - لیکن اگر امت کیلئے انتخاب کا موقع باقی نہ رہا ہو تو خلیفہ تسلیم کر لینے کیلئے بجز اسلام اور انعقاد حکومت (یعنی حکومت کے جماؤ اور جگہ پکڑ لینے) کے اور کوئی شرط نہیں ہے - خلفاء راشدین کے بعد سے جامع الشروط کوئی بھی سلسلہ خلافت قائم نہ ہوا - بنو امیہ و عباسیہ میں اگر ایک شرط قرشیۃ کی

پائی جاتی تھی، تو اور بہت سی اہم شرطیں مفقود تھیں۔ بنیادی شرط یہ ہے کہ حکومت نلوار کے زور سے نہ منوائی جائے بلکہ امت کے انتخاب و اجماع سے ہو، سو یہ شرط کسی کی خلافت میں بھی نہ تھی۔ پھر خلیفہ کو عادل و منصف ہونا چاہیے۔ حکومت نظام شوری کے ساتھ کرنی چاہیے۔ سنۃ رسول اللہ اور سنت خلفاء راشدین پر عامل ہونا چاہیے۔ بجز عمر بن عبد العزیز کے کوئی بھی ان سب کا جامع نہ تھا۔ عباسیہ کے بعد حکومت عجمیوں کے ہاتھ آئی، اور پھر مصر کے عباسی خلفاء کے بعد ترکوں کا خاندان عثمانیہ خلافت پر قابض ہوا۔ آخری مصری خلیفہ نے خود سلطان سلیم کے ہاتھ پر بیعت کی۔ یہ خلافت بلا نزاع آج تک قائم اور تمام عالم اسلامی کیلئے شرع و امت کا مرکزی اقتدار ہے۔ اگر بنو امیہ و عباسیہ میں پانچ شرطیں نہیں پائی جاتی تھیں تو ان میں چھ نہ سہی۔ یعنی یہ عرب بھی نہیں اور قرشی بھی نہیں۔ لیکن چونکہ سوال خلیفہ کے انتخاب کا نہیں ہے بلکہ ایک قائم و نافذ خلافت کے ماننے کا، اسلئے شرائط کی بحث یہاں کوئی اثر ہی نہیں رکھتی۔

منجملہ شروط خلافت کے ایک متفق علیہ شرط حریت کی ہے۔ یعنی خلیفہ آزاد ہو۔ غلام نہ ہو۔ مصلحت و ضرورت بھی اسکی ظاہر ہے، مگر معلوم ہے کہ تمام دنیا کی تاریخ میں صرف ایک مسلمانوں ہی کی تاریخ اسکی مثال پیش کر سکتی ہے کہ غلاموں نے امامت کی ہے، امارت کی ہے، پادشاہت کی ہے۔ اور تمام سادات و قریش اور عرب و عجم نے انکے آگے اطاعت کا سر جھکایا ہے۔ خود مشہور حدیث ہے ”اسمعوا و اطیعوا و ان استعمل علیکم عبد حبشی کان راسہ زبیہہ“ اور روایت ابوذر عند مسلم کہ ”ان کان عبداً موجد اطراف“ اور روایت ابن حصین کہ ”و لو استعمل علیکم عبد یقودکم بکتاب اللہ، اسمعوا لہ و اطیعوا“ یعنی اگر ایک ذلیل سے ذلیل حبشی غلام بھی تمہارا امیر ہو جائے تو اسکی سنو اور اطاعت کرو۔ حافظ نزاری اسکی شرح میں لکھتے ہیں ”و المراد اخس العبد - ای اسمع و اطیع و ان کان دنی النسب“ حتیٰ لو کان عبد اسود مقطوع اطراف، فطاعته واجبة، و یتصور امارة العبد اذا رآه بعض الائمة، او یغلب علی البلاد بشركته و اتباعه، و لا یجوز ابتداء عقد الولاية لہ مع الاختیار، بل شرطها الحریة“ (جلد ۲: ۱۲۵) یعنی یہ جو فرمایا کہ اگرچہ حبشی غلام ہو، تو مقصود اس سے یہ ہے کہ اگرچہ امیر نہایت ذلیل نسب و خاندان کا ہو، لیکن اگر

امیر ہو گیا ہے تو اطاعت کر - اور اسی بنا پر غلام امیر ہو سکتا ہے اگر کسی امام نے مقرر کر دیا ہو - یا خود وہ شہر پر غالب آ کر مسلط ہو گیا ہو - البتہ جائز نہیں کہ ابتدا میں کسی غلام کو امیر منتخب کیا جائے - کیونکہ آزاد ہونا شرائط امامت میں سے ہے “

جب غلبہ تسلط کی صورت میں خود حافظ نواری (جو شرط قرشیہ کے سب سے بڑے حامیوں میں سے ہیں) نص حدیث کی بنا پر تسلیم کرتے ہیں کہ ایک دنی النیب ، خسیس الحال ، حبشی غلام امیر ہو سکتا ہے اگرچہ آزاد ہونا شرط ابتدائی ہے ، تو پھر ظاہر ہے کہ ایک غالب و مسلط اور منظم و قائم خلیفہ کی خلافت کیلئے شرط قرشیہ کا موجود نہ ہونا کیوں مہل ہو اگرچہ قرشیہ ایک شرط ابتدائی مان لی جائے ؟

پس یہ مان لینے کے بعد بھی کہ قرشی ہونا شرائط شرعیہ میں سے ہے ، ترکان عثمانی کی خلافت مسلمہ و منعقدہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا ، اور شرائط کی پوری بحث موجودہ مسئلہ سے یک قلم غیر متعلق ہے ، تاہم تحقیق مقام کے خیال سے بہتر ہے کہ اس شرط کی حقیقت پر بھی ایک فیصلہ کن نظر ڈال لی جائے -

سوراضح ہو کہ جہان تک قرآن و سنت اور آثار صحابہ کے دلائل کا تعلق ہے ، کوئی نص قطعی موجود نہیں ، جس سے ثابت ہو کہ اسلام نے معاملہ خلافت و امامت صرف خاندان قریش کیلئے شرعاً مخصوص کر دیا ہے - احادیث اس بارے میں جس قدر موجود ہیں ، سب صحیح ہیں - یہ بھی حق ہے کہ حضرت ابوبکر نے مجمع صحابہ میں اس کو پیش کیا اور کسی نے انکار نہ کیا - یہ بھی حق ہے کہ صحابہ میں ہمیشہ اس بات کی شہرت رہی - یہ بھی غلط نہیں کہ جب تک خاندان عباسیہ باقی رہا ، لوگ اس کو بطور ایک شرط کے سمجھتے رہے - با ایں ہمہ ان ساری باتوں کی حقیقت وہ نہیں ہے جو اب سمجھی جاتی ہے - ان ساری باتوں کے سچ ہونے کے ساتھ یہ بھی سچ ہے کہ اسلام نے خلافت کو نہ کسی قوم میں مخصوص کیا ، نہ کسی خاندان میں ، اور نہ کسی خاص نسل میں - اسلام جو اس طرح کی تمام قومی و نسلی امتیازات کے مٹانے اور ہمیشہ کیلئے صرف انسانیت کی بے قید و عام عظمت کے قائم کرنے اور ” عمل “ کے قانون الہی کے آخری اعلان کیلئے آیا تھا ، کسی نسبت ساری باتیں مان لی جاسکتی ہیں لیکن یہ محال ہے کہ اسنے خاندان و نسل کا کوئی امتیاز

قائم کیا ہو ، بلکہ اس سے بڑھکر اسلام کے دامن صداقت پر کوئی دھبہ نہیں ہوسکتا کہ اُسپر کسی طرح کے بھی اختصاص نسل و قوم کی تہمت لگائی جائے ۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ امتیاز نسب کے جس بت کو تورنا اُسکا سب سے بڑا کارنامہ ہو ، اُسی کے تکرر کو پھر جوڑنا اُسکی طرف منسوب کیا جائے ؟

تفصیل و دلائل کی ضرورت نہیں ۔ یہ بات ہر اُس شخص پر جو اسلام سے کچھ بھی واقفیت رکھتا ہے ، روشن ہے کہ نسلی و خاندانی امتیازات کی نسبت عام اسلامی احکام کا کیا حال ہے ؟ اسلام کا ظہور عرب میں ہوا جنکے غرور قوم و نسب کا یہ حال تھا کہ وہاں کا ایک چرواہا اپنے نسبی و خاندانی شرف کے سامنے قیصر و کسریٰ کو بھی ذلیل و حقیر سمجھتا تھا ۔ ۔ عرب کے علاوہ بقیہ دنیا بھی طرح طرح کے قومی و وطنی امتیازات کی پرستش کر رہی تھی ۔ اسلام نے اپنی دعوت کی سب سے پہلی اور کاری ضرب اسی غرور نسل و قوم کے بت پر لگائی ، اور اللہ کے اس قانون فطرۃ کی ممانعت بلند کی کہ بنیاد ہر طرح کی فضیلت کی عمل ہے نہ کہ کوئی آدرش :

یا ایہا الناس ! انا خلقناکم من ذکر و انثیٰ و جعلناکم شعوباً و قبائل لتعارفوا ۔
ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم (۴۹ : ۱۴) اور فرمایا : لا تزر رازرۃ رزر اخریٰ

و ان لیس للانسان الا ما سعی ، و ان سعیہ سوف یرى (۵۳ : ۴۹)
آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا زندگی بھر قول و فعل یہ رہا کہ ” لیس منا من دعی الی عصبیۃ “ اور ” لیس منا من قاتل علی عصبیۃ “ اور ” لیس منا من مات علی عصبیۃ “ و امثالہا ۔ یعنی وہ ہم میں سے نہیں جو نسل و قوم کی خصوصیت کے تعصب کی طرف لوگوں کو بلائے ۔ وہ ہم میں سے نہیں جو اس تعصب کی حالت میں دنیا سے جائے ۔ وہ ہم میں سے نہیں جو اس تعصب کی بنا پر لوگوں سے جنگ کرے ! دنیا کو چھوڑنے سے پہلے حجتۃ الوداع میں جو آخری پیام امت کو سنایا ، اُس میں بھی سب سے پہلی چیز یہی تھی ۔ یعنی نوع انسانی کی عام مسارات کا اعلان : ” لا فضل لعربی علی عجمی ، و لا لعجمی علی عربی ۔ کلکم ابناء آدم “ اور فرمایا ” لیس لا حد فضل علی احد الا بدین و تقویٰ ۔ الناس کلہم بنو آدم “ و آدم من تراب “ یعنی اسلام کا ظہور و قیام نوع انسانی کی مسارات اور باہم دیگر

برابری کا اعلان ہے - اب نہ کسی عرب کو عجمی پر، اور نہ کسی عجمی کو عرب پر ملک و قوم کی وجہ سے فضیلت ملاحظہ کی ہے - سب ایک ہی آدم کی اولاد ہیں، اور وہی سب سے بڑا ہے جو عمل میں بڑا ہو۔

عملاً یہ حال تھا کہ اپنے اپنی زندگی میں سب سے آخری اور ذمہ داری کے لحاظ سے نہایت اہم فوجی مہم جو بھیجی، اس کی سرداری آسامہ بن زید کو دی، اور معلوم ہے کہ زید آپسے غلام تھے - بعضوں پر یہ بات گراں گزری تو فرمایا ”لقد طعنتم فی امارۃ ابیہ و قد کان لہا اہلاً“ ان آسامہ لہا اہل، تم لوگ پہلے زید کی سرداری پر بھی طعن کر چکے ہو حالانکہ وہ اس کام کا اہل تھا، اور اب آسامہ سردار بنایا گیا ہے اور وہ اس کام کا اہل ہے۔ ”اہل“ کے لفظ پر زور دیا - یعنی طعن بیکار ہے کیونکہ بنیاد معاملہ امارت و سرداری کی صرف اہلیت و قابلیت ہے - اور کوئی نہیں - حضرت عائشہ کا قول مشہور ہے ”لو کان زید حیاً ما استخلف رسول اللہ غیرہ“ (۱) آسامہ کو جس لشکر کی سرداری دی گئی، جانتے ہو اسمیں کیسے کیسے لوگ ماتحت کیے گئے تھے؟ بڑے بڑے مہاجرین و قریش - جن میں سب سے پہلے حضرت ابوبکر صدیق کا نام نظر آتا ہے - وہی ابوبکر (رض) جو چند دنوں کے بعد رسول اللہ کے جا نہیں ہونے والے ہیں!

بندۂ عشق شدی، ترک نسب کن جاسی

کہیں دریں راہ فلان ابن فلاں چیزے ندست!

(۱) اللہ اللہ! اس بارے میں اسلام و پیروان اسلام کے معاملات کیسے خرد فروشانہ و عجیب رہے ہیں؟ آج مسلمانوں کو جو طرح طرح کے خاندانی امتیازات و تفریقات کی بت پرستانہ پرستش کر رہے ہیں، کیونکر یاد دلایا جائے کہ ایک زمانے میں بحز اللہ اور اس کے رسول کے رشتہ کے نہ کوئی رشتہ مقبول تھا، نہ عمل کی بزرگی کے سوا کوئی بزرگی تسلیم کی جا سکتی تھی - حضرت عمر کے زمانہ خلافت کا ایک واقعہ مجھے نہیں بھولتا - آنکے لڑکے عبد اللہ نے ایک بار شکایت کی کہ تقسیم اموال وغیرہ میں آسامہ بن زید سے مجھے کم درجہ پر کیوں رکھا جاتا ہے؟ حضرت عمر نے کہا ”کان ابوہ احب الی رسول اللہ من ابوبکر“ کان احب الی رسول اللہ منک، اس لیے کہ تیرے باپ سے زیادہ اس کا باپ اللہ کے رسول کو پیارا تھا، اور اس لیے کہ وہ خرد بھی تجھ سے زیادہ رسول اللہ کے نزدیک محبوب تھا!

بلال حبشی، صہیب رومی، سلمان فارسی (رض) کا جو حال تھا، معلوم ہے۔ بلال کو عمر فاروق جیسے قرشی نے ”ہمارا آقا و سردار“ کہا۔ اور صہیب کو دیکھتے تو کہتے ”نعم العبد صہیب! لو لم یخف اللہ لم یعصہ“ مرنے کے وقت وصیۃ کی کہ نماز جنازہ بھی پڑھائیں۔ سلمان کا یہ حال تھا کہ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ”سلمان منا اہل البیت“ اسی چیز کا نتیجہ تھا کہ ایک صدی کے اندر ہی اندر عرب کی نسلی عصبیۃ کا نام و نشان باقی نہ رہا، ارورہ زمانہ آگیا جب بزرگی و فضیلت کے ہر میدان میں سرداری و ریاست عجمیوں اور غلام زادوں کے ہاتھ میں تھی۔ عرب انکے علم و عمل کے آگے اسی طرح جھکے ہوئے تھے، جس طرح ایک قرشی و ہاشمی کے آگے جھک سکتے تھے۔ حتیٰ کہ خلیفہ ہشام بن عبد الملک کو امام زہری سے کہنا پڑا ”واللہ لیسودن الموالی العرب“ و یخطب لہم علی المنابر، و العرب تحتہم!“

پھر کیا ایسی حالت میں ایک لمحہ کیلیے بھی بارر کیا جاسکتا ہے کہ اسلام کا داعی تمام دنیا کو تو قومی و نسلی امتیازات کی غلامی سے نجات دلانا چاہتا ہو اور مسارات عامہ کی طرف بلا رہا ہو، لیکن (نعوذ باللہ) خود اسدرجہ خود غرض ہو کہ قیامت تک کیلیے پادشاہی و خلافت کو صرف اپنے ہی ملک کیلیے، اور اپنے ملک ہی کیلیے نہیں، خاص اپنے ہی وطن کیلیے، اور صرف اپنے وطن ہی کیلیے نہیں، خاص اپنے قبیلے کیلیے، اور پھر صرف قبیلہ ہی کیلیے نہیں، بلکہ صرف اپنے ہی خاندان کیلیے مخصوص کردے؟ وہ ساری دنیا سے کہے کہ تمہارے سارے بڑے ہوئے حق چھوڑتے ہیں۔ سچا حق صرف عمل اور اہلیت کا ہے۔ لیکن خود اپنے لیے یہ کر جائے کہ نہ تو عمل اور نہ اہلیت، بلکہ صرف قوم، صرف نسل، اور صرف خاندان؟

کیا اسلام کیلیے اس سے بھی بڑھ کر کوئی عجیب بات ہو سکتی ہے؟ خیر، یہ بات کتنی ہی عجیب ہوتی، لیکن ہم بارر کر لیتے اگر فی الحقیقت قرآن و سنت نے واقعی تہرا دی ہوئی۔ ہمارے نزدیک کسی اسلامی اعتقاد کی صحت و عدم صحت کا معیار صرف یہ ہے کہ کتاب و سنت سے بطریق صحیح ثابت ہو۔ نہ کہ ہماری عقلوں اور

سمجھوں کا احاطہ و ادراک - لیکن استعجاب کی ساری بنیاد ہمارا عقلی و قیاسی استبعاد نہیں ہے - یہی ہے کہ کسی نص سے ایسا ثابت نہیں اور چونکہ ثابت نہیں، اسلیے ہم جانتے ہیں کہ اسلام کیلئے کوئی ایسی بات ثابت بھی نہیں ہونی چاہیے -

شارع کے بیانات، انسان کی عام بول چال کی طرح مختلف قسموں کے واقع ہوئے ہیں - ازانجملہ ایک صورت احکام و اوامر اور تشریع کی ہے - دوسری قسم اخبار و اطلاعات کی - یہ دوسری قسم مجرد بیان واقعہ و حال ہے، اور اگر آئندہ کی نسبت ہے تو پیشین گوئی ہے - حکم اور تشریع نہیں ہے - یعنی صرف ایک اطلاع ہے کہ ایسا ہوگا - یہ نہیں ہے کہ ایسا کرنا چاہیے - قریش کی خلافت کی نسبت جسقدر روایات موجود ہیں، سب دوسری قسم میں داخل ہیں - نہ کہ پہلی قسم میں - اور جب اس حدیث کے تمام طریقوں اور لفظوں کو جمع کر کے دیکھا جائے، تو بلا کسی اضطراب کے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے -

یہ حدیث صحاح میں حضرت ابو ہریرہ، جابر بن عبد اللہ، جابر بن سمرہ، معاریہ بن سفیان، وغیرہم مختلف صحابہ سے مروی ہے، اور عمدہ طریق وہ ہیں جو بخاری و مسلم نے اختیار کیے ہیں - لیکن کسی طریق سے بھی کوئی ایسا لفظ مروی نہیں جس سے ثابت ہو کہ مقصود پیشین گوئی نہ تھا - تشریع و امر تھا - ”تشریع“ یعنی یہ حیثیت احکام شریعت کے کسی حکم کا دینا اور شرعی قانون ٹھہرا دینا -

عن ابی ہریرہ ”الناس تبع لقریش فی هذا الشأن - مسلمہم لمسلمہم و کافرہم لکافرہم“ (مسلم) دوسرے طریق میں زیادہ وضاحت ہے ”مسلمہم تبع لمسلمہم“ و کافرہم تبع لکافرہم“ (مسلم) جابر کی روایت میں ”الناس تبع لقریش فی الخیر و الشر“ ہے - امام نواری اسکی شرح میں لکھتے ہیں ”معناہ فی الاسلام و الجاہلیۃ - لانہم کانوا فی الجاہلیۃ رؤساء العرب و اصحاب حرم اللہ و اهل الحج“ و کانت العرب تنظر اسلامہم فلما اسلاموا فتحت مکہ تبعہم الناس و جاءت وفود العرب من کل جہۃ و دخل الناس فی دین اللہ افواجا“ (جلد ۲ : ۱۱۹) پس معلوم ہوا کہ اس حدیث کو مسئلہ خلافت کے اختصاص و شرائط سے کوئی تعلق نہیں - مقصود یہ ہے کہ عرب میں خاندان قریش حج کے اہتمام اور بیت اللہ کی معارفہ کی وجہ سے تمام قبائل کی سرداری رکھتا تھا، اور ہر کام میں سب

کی نظریں اُسی پر اُٹھتی تھیں - جب تک مکہ فتح نہوا اور قریش مسلمان نہ ہوئے ، تمام عرب کے قدم رکے رہے - جونہی قریش مسلمان ہوئے ، سب نے اُنکی پیروی کی ، اور اپنے اپنے وفد بھیجنا شروع کر دیے - حتیٰ کہ تمام عرب مسلمان ہو گیا - پس فرمایا ”الناس تبع لقریش“ لوگ جاہلیۃ اور اسلام ، دونوں حالتوں میں قریش کے تابع ہوئے - وہ بگڑے رہے تو سارا عرب بگڑا رہا ، وہ سنورے تو سب سنور گئے - اور یہ بالکل حق و معلوم ہے - ہمیشہ اور ہر ملک میں سردار جماعتوں اور بڑے لوگوں کا ایسا ہی اثر تمام ملک پر ہوتا ہے - اچھی بری ، ہر طرح کی باتوں میں لوگ اُنہی کی پیروی کرتے ہیں - حضرت ابوبکر کی روایت سے یہی حدیث مسند امام احمد میں یوں مروری ہے ”برالناس تبع لبرہم“ و فاجر ہم تبع لفاجر ہم“ اور بیہقی نے حضرت علی سے روایت کیا ”کان هذا الامر فی حمیر فنزعه الله منهم رجعله فی قریش“ لیکن اس سے یہ کہاں نکلا کہ مسلمانوں کا خلیفہ بجز اُنکے کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا ؟ اسلام صرف عرب ہی کا اسلام نہ تھا جس میں ممتاز قریش تھے - اسلام تمام عالم کیلئے اسلام ہے جسکی سرداری و ریاست صرف علم و عمل حق ہی کو مل سکتی ہے ، اور یہ سرداری اسلام ہی نے دلائی ہے !

امام مسلم نے جابر بن سمرہ سے ایک اور حدیث روایت کی ہے : ”ان هذا الامر لا ینقضی حتی یمضی فیہم اثنا عشرۃ خلیفۃ“ ثم تکلم بکلام خفی علی - قال فقلت لا بی ما قال ؟ قال کلہم من قریش“ حاصل اسکا اور اسکی ہم معنی روایتوں کا یہ ہے کہ آپ آئندہ کی نسبت خبر دے رہے ہیں اور فرماتے ہیں ، ضرور ہے کہ بارہ خلیفہ ہوں - سب قریش سے ہونگے - اس طرز بیان کی وضاحت نے ظاہر کر دیا کہ اس بارے میں جو کچھ کہا جا رہا ہے ، اس سے صرف ائندہ کی نسبت اطلاع مقصود ہے - حکم و تشریع نہیں ہے -

ان سب کے بعد وہ حدیث آتی ہے جسکو امام بخاری نے باب ”الامراء من قریش“ کی بنیاد قرار دیا ہے - تمام روایات کے ساتھ یہ حدیث سامنے رکھی جائے تو پوری طرح اصلیت روشن ہو جاتی ہے - امیر معاویہ کی مجلس میں ایک مرتبہ ذکر آیا کہ عبد اللہ بن عمرو کہا کرتے ہیں ”سیکون ملک من قحطان“ قحطان میں سے ایک پادشاہ ہوگا - امیر معاویہ یہ سنکر غضب ناک ہوئے اور خطبہ دیا : ”بلغنی ان رجلاً منکم بعد ثون احادیث لیست

فی کتاب اللہ ر لا تؤثر عن رسول اللہ الخ - مجھے تک یہ بات پہنچتی ہے کہ تم میں سے کچھ لوگ ہیں جو ایسی باتیں کہتے ہیں جو نہ تو قرآن میں ہیں نہ رسول سے ثابت ہیں - ”انی سمعت رسول اللہ یقول : ان هذا الامر فی قریش ، لا یعادہم احد ، الا کبه اللہ علی رجبہ ، ما اقاموا الدین“ میں نے رسول اللہ سے سنا ہے کہ یہ بات (یعنی حکومت) قریش میں رہیگی جب تک وہ دین قائم رکھیں گے - جو انکی مخالفت کریگا ، اَللّٰہ رسوا ہوگا - یعنی کامیاب نہوگا -

اس روایت نے سارا معاملہ حل کر دیا - معلوم ہو گیا کہ ایک خاص وقت تک کیلیے یہ پیشین گوئی تھی ، اور حرف بہ حرف پوری ہوئی - یعنی آپؐ بنا دیا تھا کہ قریش میں جب تک دین قائم رکھنے کی قابلیت رہیگی ، حکومت انہی کے قبضے میں رہیگی - جو انکے خلاف اُٹھیں گے ، ناکام رہیں گے - چنانچہ ایسا ہی ہوا - جب تک عرب و قریش میں ملاحیت رہی ، اسلامی خلافت کے بھی مالک رہے - جب اسکے اہل نہ رہے ، عجم و ترک نے یہ بار اُٹھالیا - بحکم ان یثاہبکم ریات بخلق جدید“ وما ذلک علی اللہ بعزیز (۱۶:۳۰) اور یستبدل قوما غیرکم الخ - باقی رہا امیر معاویہ کا ابن عمر پر انکار ، تو یہ بھی صحیح نہ تھا - وہ صرف یہ بات سن کر گھبرا اُٹھے کہ دوسری پادشاہت بننے والی ہے - اصلیت پر غور نہیں کیا - قحطانی رالی حدیث بطریق رفع ثابت ہے ، اور قریش رالی حدیث میں ”ما اقاموا الدین“ کی قید موجود ہے - دونوں میں کوئی تعارض نہیں - اسی بنا پر ائمہ حدیث نے حدیث قحطانی اور حدیث قریش میں تطبیق دیتے ہوئے صاف صاف لکھ دیا کہ امارۃ قریش رالی روایت تشریع نہیں ہے - محض خبر ہے - اور وہ بھی ”ما اقاموا الدین“ کے ساتھ مقید - شیخ الاسلام لکھتے ہیں ”هذا انکار من معاویہ بلا تأمل ، والا ، فقد جاء حدیث القحطانی مرفوعاً ، و ما ذکر فی المعارضة ، فهو حجة لما فیہ من التقلید بقوله : ما اقاموا الدین“ اور حافظ عسقلانی نے فتح میں ابن التین کا قول نقل کیا ہے ”الذی انکر معاویہ فی حدیث ما یقرہ لقرہ ما اقاموا الدین ، فردما کان فیہم من لا یقیمہ فیتسلط القحطانی علیہ و هو کلام مستقیم“ یعنی امیر معاویہ کا سرے سے انکار انکی بے غوری کا نتیجہ تھا - ورنہ قحطانی رالی بات ثابت ہے - امیر معاویہ نے جو حدیث معاویہ میں پیش کی ، اسکا آخری تکرار خود انہی پر حجة ہے اور ابن عمر کی تصدیق کر رہا ہے - یعنی اُسمیں ”ما اقاموا

الدین ” کی قید ہے - اس سے ثابت ہوا کہ جب قریش میں ایسے لوگ نہ رہینگے جو دین قائم رکھے سکیں تو پھر کوئی غیر قرشی مسلط ہو جائیگا -
 صحیح بخاری کے ترجمہ باب سے صاف واضح ہوتا ہے کہ امام بخاری کا بھی مذہب یہی ہے - انہوں نے باب باندھا ہے ” الامراء من قریش “
 قریش میں امارت اور امراء - اس مضمون کا باب نہیں باندھا کہ امارت ہمیشہ قریش ہی میں ہونی چاہیے -

امام بخاری نے ایک دوسری روایت بھی ابن عمر کی درج کی ہے جو مسلم وغیرہ میں بھی ہے ” لا یزال هذا الامر فی قریش ما بقی منهم ائذان “ یعنی یہ چیز قریش ہی میں رہیگی جب تک دو آدمی بھی ان میں باقی رہینگے -

اس روایت سے ہمارے بیان کی آرزو تصدیق ہوگئی - حدیث کا منطوق صریح پیشین گوئی کا ہے - اگر اسکا یہ مطلب قرار دیا جائے کہ جب تک دو انسان بھی خاندان قریش میں باقی رہینگے خلافت انہی کے قبضہ میں رہیگی ، تو یہ واقعات کے بالکل خلاف ہے - دو کی جگہ ہزاروں قرشی انسان موجود رہے اور خلافت قریش سے نکل گئی - پس ضرور ہے کہ ” ما بقی منهم ائذان “ کے منطوق پر مفہوم کو ترجیح دی جائے -
 اور وہ یہی ہے کہ اگر قریش میں دو آدمی بھی ایسے باقی رہینگے جو خلافت کے اہل ہونگے ، تو کبھی خلافت کے شرف سے یہ خاندان محروم نہ ہوگا - مگر جب انقلاب حال سے ایسا وقت آجائے کہ دو آدمی بھی اہل نہ رہیں ، تو مشیت الہی اپنے قانون انتخاب اصلاح کے مطابق دوسروں کو اس کام پر مامور فرمادیگی ، اور قریش خلافت سے محروم ہو جائینگے - چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ ایسا ہی ہوا - معتصم کے بعد سے عباسیہ کا زوال شروع ہوگیا تھا - آخر میں یہاں تک پہنچ گیا کہ حکومت دوسروں کی تھی ، عباسی خلیفہ صرف اپنے عشرت کدوں کیلیے تھا - تاہم اقتدار خلافت انہی کا رہا - کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ خلافت کا دعوا کرے - کیسی کیسی طاقتور اور باجبروت عجمی و ترکی اور سلجوقی حکومتیں قائم ہوئیں ؟ لیکن سب اپنا بڑا سے بڑا شرف یہی سمجھتے رہے کہ مقام خلافت سے انہیں خدمت و یارری خلافت کا کوئی لقب ملجائے ، اور بس - ایک قرشی ، فاطمی ، عباسی بھی اگر کسی ہنگامہ و قتال سے بچکر نکل جاتا ، تو جس گوشہ عالم میں تنہا پہنچ جاتا ، ایک عالم

اُسکے ساتھ ہو جاتا اور اپنی حکومت قائم کر لیتا - گویا ہر قرشی کے وجود میں ایک خلافت پنہاں تھی - ایک امری شہزادہ شام کے قتل عام سے بچ کر نکلا اور افریقہ ہو کر یورپ جا پہنچا - وہاں پانچ صدیوں تک کیلیے اسپین کی عظیم الشان اسلامی سلطنت قائم ہو گئی - لیکن جب عرب و قریش کے تزلزل و ادبار کا وہ آخری وقت آ گیا کہ دو قرشی بھی دنیا میں حکمرانی کے اہل و لائق باقی نہ رہے ، تو تاریخ خلافت نے معاً صفحہ اُلٹ دیا ، اور یکقلم غیر عربی و غیر قرشی خلافت کا دور شروع ہو گیا -

ر کان رعداً مفعولاً !

باقی رہی مشہور حدیث ” الائمة من القریش “ اور یہ استدلال کہ حضرت ابوبکر نے سقیفہ بنی ساعدہ کے مجمع میں بر خلاف انصاریہ کی اور سب نے تسلیم کر لیا ، تو اس سے بھی شرعاً اختصاص قریش کے دعوے کو کوئی مدد نہیں مل سکتی - اولاً ، یہ الفاظ اور حضرت ابوبکرؓ والی روایت بطریق اتصال ثابت ہی نہیں - فتح الباری میں ہے ” الائمة من القریش - رجاله رجال الصحیح و لكن فی سنده انقطاع “ ثانیاً ، اس سے بھی یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ خلافت کا شرعاً حق بجز قریش کے اور کسی مسلمان کو نہیں ؟ یہ بھی آئندہ کی نسبت خبر ہے ، اور انہی حدیثوں کا ایک ٹکڑا جو دوسرے طریقوں سے مریم پیشین گوئی کے لفظوں میں پڑ چکے ہو - حضرت ابوبکرؓ نے یہ بات اس لیے پیش کی کہ پیشتر سے ہونے والے واقعات کی خبر دیدی گئی ہے - پس ایسا ہی ہونا ضروری ہے - اس کے خلاف بات نہ آتھاؤ - یہ سن کر انصار مایوس ہو گئے اور تسلیم کر لیا - ثالثاً ” الناس تبع لقریش “ والی روایت سے مدد لی جائے تو بالکل کھل جاتا ہے کہ سقیفہ میں حضرت ابوبکرؓ کا استدلال صرف قریش کی بزرگی و عظمت اور عرب میں ان کی ریاست و سرداری سے تھا - نہ کہ شرعاً شرائط امامت سے - وہ بتلانا چاہتے تھے کہ خود آنحضرتؐ نے فرمادیا ہے کہ جاہلیہ اور اسلام ، دونوں میں لوگ قدرتی طور پر قریش کی سرداری سے متاثر ہیں اور رہینگے ، اس لیے یہ معاملہ بھی انہی کے قبضہ میں رہیگا - چنانچہ حضرت ابوبکرؓ کا یہ مشہور جملہ اس مطلب کو زور دے واضح کر رہا ہے جو سقیفہ میں کہا تھا ” ان العرب لا تعرف هذا الامر لغير هذا الحی “ یعنی اہل عرب قریش کے سوا اور کسی قبیلہ کی سرداری سے آشنا نہیں - پس یہاں سرے سے شرائط شرعیہ کا سوال ہی نہ تھا -

صرف ملکی و رقعی مصالح کی بنا پر استدلال تھا کہ کس قبیلہ و خاندان سے امام ہونا چاہیے جسکی سرداری عرب کے تمام قبائل بلا چون و چرا تسلیم کر لیں ؟ اس امر کا کوئی ثبوت موجود نہیں کہ صحابہ خلافت کا شرعاً مستحق صرف قریش ہی کو یقین کرتے تھے ، بلکہ اسکے خلاف شواہد موجود ہیں ۔ امام احمد نے حضرت عمر کا قول نقل کیا ہے ۔ اگر معاذ بن جبل میری وفات تک زندہ رہے تو اپنے بعد انہی کو خلیفہ بناؤنگا ۔ یہ ظاہر ہے کہ معاذ قرشی نہ تھے ۔ انصار مدینہ میں سے تھے ۔ اگر خلافت کیلئے قرشیہ شرط ہوتی تو حضرت عمر جیسا معمر اسرار خلافت کیونکر آنکی خلافت کا تصور بھی کرسکتا تھا ؟ مسند امام احمد میں حضرت عمر کا ایک اور قول بھی ابو رافع کی روایت سے موجود ہے ” لو ادرکنی احد رجلین ثم جعلت هذا الامر الیہ “ اوثقت بہ ۔ سالم مولیٰ حذیفہ و ابو عبیدہ الجراح “ اگر سالم مولیٰ حذیفہ اور ابو عبیدہ الجراح میں سے کوئی ایک میری وفات تک زندہ رہتا اور خلافت اُسکے سپرد کردیتا “ تو مجھے اس بارے میں پررا اطمینان و اعتماد ہوتا ۔ اگر حضرت عمر صدها صحابہ و مہاجرین قریش کی موجودگی میں سالم مولیٰ حذیفہ کو خلافت سپرد کر دینے کا ارادہ کرسکتے ہیں “ تو پھر کیسے بارر کیا جاسکتا ہے کہ شرعاً خلافت غیر قرشی کو نہیں ملسکتی اور صحابہ کا اس پر اجماع ہو گیا تھا ؟

(دعوائے اجماع)

اب صرف ایک بات رہ گئی ۔ یعنی علماء اسلام کا شرط قرشیہ پر زور دینا ، اور قاضی عیاض کا دعوائے اجماع ، تو اس بارے میں چند امور قابل غور و نظر ہیں :

اولاً “ یہ ظاہر ہے کہ قریش میں خلافت ہونے کی نسبت جو کچھ فرمایا گیا ، وہ محض آئندہ کی پیشتر سے اطلاع تھی ۔ یعنی پیشین گوئی تھی ۔ اور پیشین گوئیوں کا یہ حال ہے کہ جب تک اُنکا ظہور کامل طور پر نہ ہو جائے ، اُنکے معانی و مطالب کی نسبت کسی قطعی بات کا اختیار کرنا مشکل ہے ۔ اجتہاد و قیاس کیلئے کسی چیز میں انہی وسعت نہیں جسقدر پیشین گوئیوں میں ہوتی ہے ۔ علی الخصوص جبکہ عموماً پیشین گوئیاں نہایت اجمال و اختصار کے ساتھ ہوتی ہیں “ اور اس باب میں اُنکا ایک خاص مبہم انداز بیان ہے ۔ پس چونکہ یہ پیشین گوئی تھی “ اسلیے مشکل تھا کہ جب تک تمام واقعات پوری طرح ظاہر نہ ہو جائیں “ اُنکا ٹھیک

تھیک مطلب ملے عین کیا جا سکے - خلافت کا یہ حال رہا کہ گو ابتدا سے بہت مدعی آئے، مگر ساتویں صدی ہجری تک قریش ہی میں رہی، اور اسی بات کی احادیث میں خبر بھی دی گئی تھی - جن علماء کی رائے پیش کی جاتی ہے، وہ سب بھی جنکا ظہور ساتویں صدی اور اس سے پیشتر یعنی عہد خلافت قریش میں ہوا - پس ضرورتاً کہ معاملہ خلافت کو ابتدا سے قریش ہی میں محدود دیکھ کر یہ خیال پیدا ہو جائے کہ خلافت اسی خاندان سے شرعاً بھی مخصوص ہے اور یہی مطلب تمام احادیث کا ہے - اگر وہ بعد کا حال دیکھتے تو معلوم کر جاتے کہ مقصود تشریع و حکم نہ تھا - محض خبر دی گئی تھی - وہ ان حدیثوں کا مقصود صرف اپنے وقت تک کے حالات کی روشنی ہی میں دیکھ رہے تھے، اور اسکے لیے ہر طرح مجبور و معذور تھے -

حافظ نواری شرح مسلم میں لکھتے ہیں ”وقد ظہر ما قالہ صلعم - فمن زمنہ الى الان الخلافة فی قریش من غیر مزاحمة لهم فیہا“ رتبقری کذا لک ما بقی منهم اثنان“ (جلد ۲ : ۱۱۹) یعنی جیسا فرمایا تھا، ویسا ہی ہوا - آنحضرت صلعم کے زمانے سے اب تک خلافت بغیر کسی رکوت کے قریش ہی میں رہی، اور آئندہ بھی ہمیشہ انہی میں رہیگی جب تک در قریشی بھی دنیا میں باقی رہینگے -

حافظ نواری کا سال وفات سنہ ۴۷۶ھ ہے - اور سال پیدائش سنہ ۴۳۱ھ - یا اس سے بھی پہلے - آخری خلیفہ بغداد المستعصم کو ہلاکو نے سنہ ۶۵۶ میں قتل کیا - پس گو آنکی وفات فتنہ تاتار کے بعد ہوئی، لیکن تصنیف و تالیف کا زمانہ مستعصم کی خلافت ہی کا زمانہ ہے - اس لیے وہ اپنے زمانے تک خلافت کو صرف قریش ہی میں قائم دیکھ کر احادیث باب کے اسی مطلب پر قانع اور جمے ہوئے ہیں، اور اسی لیے ”ما بقی منهم اثنان“ کا بھی یہی مطلب سمجھتے ہیں کہ جب تک خاندان قریش کے در انسان بھی دنیا میں باقی رہینگے، خلافت انہی میں رہیگی - لیکن اگر اُنکو اپنے بعد کا حال معلوم ہوتا تو کیا ایسا دعوا کر سکتے تھے؟ کیا اُس صورت میں اپنی تمام رائے پر نظر ثانی نہ کرتے؟ وہ کیا جانتے تھے کہ عنقریب صفحہ اُلتانے والا ہے اور خلافت نہ صرف قریش سے، بلکہ عرب ہی سے رخصت ہو جانے والی ہے - جو علماء اس انقلاب کے بعد پیدا ہوئے، اور انہوں نے ہر زمانہ پایا جب ”ما اقاموا الدین“ کا ظہور پوری طرح ہو چکا تھا - یعنی

خلافت قریش کے خالدان سے نکل چکی تھی ، تو یہ حالات دیکھ کر آنکھیں راسے بدل گئی ، اور قاضی عیاض والے اجماع کا دعوا باقی نہ رہا - علامہ ابن خلدون (المتولد سنہ ۷۳۲) مقدمہ تاریخ میں شرط قرشیہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں : ” لما ضعف امر قریش ، وثلاشت عصبیتہم بما نالہم من الترف و النعم و بما انفقتہم الدولة فی سائر اقطار الارض ، عجزوا عن حمل الخلافة ، و تغلبت علیہم الاعاجم و صار الحل و العقد لہم ، فاشتبه ذلک علی کثیر من المحققین ، حتی ذہبوا الی نفی اشتراط القرشیة و عولوا علی ظاہر فی ذلک مثل قوله صلعم : اسمعوا و اطیعوا و ان امر علیکم عبد حبشی ما اقام فیکم کتاب اللہ “ یعنی جب قریش کی قوت کمزور ہو گئی - عیش پرستیوں میں پڑ کر اپنی عصبیتہ متا دی - خلافت کا بوجہ اٹھانے سے عاجز آ گئے ، تو عجمیوں نے آپر غلبہ حاصل کر لیا ، اور خلافت کا فیصلہ انہی کے ہاتھوں میں چلا گیا - یہ انقلاب دیکھ کر بہت سے محققین کے نزدیک قرشیہ کی شرط مشتبہ ہو گئی - یہاں تک کہ انہوں نے اس شرط سے انکار کر دیا - انتہی -

اشاعرہ کے امام الائمہ قاضی ابوبکر باقلانی نے یہی مذہب اختیار کیا تھا کہ قرشیہ کی شرط ضروری نہیں ہے - یہی ابن خلدون لکھتے ہیں ” ومن الغائلین بنفی اشتراط القرشیة ، القاضی ابوبکر الباقلائی “

تیسرے صدی کے مشہور مجدد فقہ و حدیث ، و مجتہد العصر ، مصلح امت ، امام شرکانی یمنی کی بھی یہی تحقیق ہے - بل الغمام میں شرط قرشیہ کے دلائل نقل کر کے لکھتے ہیں ” لا رب ان فی بعض هذه الالفاظ ما يدل علی الحصر ، ولكن قد خصص مفهوم الحصر احادیث و جرب الطاعة لغير القرشي “ الی ان قال ” و الاخبار منه صلعم بان الائمة من قریش ، و الاخبار منه بان الاذان فی الحبشة و القضاء فی الازد ، و ما هو الجواب عن هذا ، فهو الجواب عن ذلک - و تخصیص كون الائمة من قریش ببعض بطونهم ، لا یتم الا بدلیل ، و الاخذ بما وقع علیه الاجماع لا شک انه احوط ، و اما انه یتعتمد المصیر الیه ، فلیس بواضح ، و لو صح ذلک ، لزم بطلان اکثر ما درنوه من المسائل و المقام و المراكز ، و ما احقه بان لا یكون كذلك “ یعنی اگرچہ امامت قریش کی روایات میں ایسے الفاظ ہیں جس سے قریش کی خصوصیت معلوم ہوتی ہے ، لیکن وجوب طاعت امام کے عام احکام کتاب و سنت میں موجود ہیں - وہ دلالت کرتے ہیں کہ غیر قرشی کی بھی طاعت امامت پر قرشی ہی کی طرح واجب ہے - باقی رہی یہ بات کہ آنحضرت

نے قریش میں امامت کی خبر دی، تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اُنکے سوا کوئی دوسرا امام نہیں ہو سکتا۔ یہ رِیسی ہی خبر ہے جیسی اس بارے میں خبر دی کہ اذان کا کام اہل حبش میں ہے اور قضاء ازیوں میں۔ جس طرح ان رِایتوں سے یہ بات نہیں نکلتی کہ مؤذن اور قاضی صرف حبشی اور ازہمی ہی ہونے چاہئیں، اُسی طرح یہ بات بھی ثابت نہیں ہوتی کہ امام صرف قرشی ہی ہو سکتا ہے۔ جو جواب اُنکا دیا جایگا، رہی اسکا ہرکا۔

یہ راضع رہے کہ جن جن علماء حدیث و کلام کے اقوال سے یہ اجماع ثابت کیا جاتا ہے، وہ سب کے سب اُسی عہد کے ہیں جبکہ خلافت عباسی قائم تھی۔ بعد والوں نے جو کچھ لیا ہے، اُنہی سے لیا ہے۔ سب سے زیادہ اعتماد اس بارے میں قاضی عیاض کے بیان پر کیا جاتا ہے جبکہ قول نزاری نے شرح مسلم اور منہاج میں نقل کیا ہے۔ انکا سال وفات سنہ ۴۴۵ھ ہے۔ پھر یہ بھی راضع رہے کہ اجماع کے دعوے نے عام طور پر جو رسمعت اختیار کر لی ہے، اور جس طرح بتدریج اس لفظ کا استعمال اپنے لغوی و اصولی معنی سے ہٹ کر مختلف مصطلحہ معنوں میں ہونے لگا ہے، اسکو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ علی الخصرص فقہاء مذاہب کے استعمالات متکلمین اور ارباب اصول کے مصطلحہ اجماع سے بالکل مختلف ہیں۔ ہر مذہب کے فقہا بلا تامل اپنے مسلک کو ”جمہور“ اور ”اجماع“ کے لفظ سے تعبیر کر دیتے ہیں۔ اسمیں کسی کا مطلب کچھ ہوتا ہے کسی کا کچھ۔ صاحب ہدایہ وغیرہ کے نزدیک عدم وجوب قراۃ فاتحہ خلف امام اور افضلیت اسفار جمہور کا قول ہے۔ بعضوں نے اجماع تک کہ دیا۔ لیکن شوافع و محدثین کہتے ہیں کہ قراۃ فاتحہ ہی جمہور کا مذہب ہے اور اسی پر جماہیر علماء کا اتفاق ہے۔ اُنہی حافظ نزاری کی (جو اشتراط قرشیہ کو جمہور کا مذہب بتلاتے ہیں) شرح مسلم دیکھ لی جائے۔ کس طرح شافعیہ کا ہر مذہب اُنکے نزدیک ”جمہور“ کا مذہب ہے، اور مخالف کا ہر قول شان۔ شافعیہ اور حنفیہ کی خلافیات میں تقریباً در تہائی مسائل تو ضرور ایسے ہونگے جنکی نسبت ہر جگہ شرح مسلم میں پاؤ گے ”ہذا مذہب الشافعی و الجماہیر“ و خالف فیہ ابو حنیفہ“ امام شافعی اور جمہور کا مذہب یہی ہے مگر امام ابو حنیفہ نے اس سے خلاف کیا۔ اگر ہمارے علماء احناف حافظ نزاری کی ان تمام جمہوریات و اجماعیات کو تسلیم کر لینے کیلئے طیار ہیں، تو خیر، شرط قرشیہ کا ایک اجماع اُر سہی !

ثانیاً، میرا یقین ہے کہ یہ بات بھی آرے شمار باتوں کی طرح وقت کے سیاسی اثرات کا نتیجہ تھی۔ یہ ظاہر ہے کہ معاملہ خلافت ابتدا سے سخت کشمکش و تزاوم میں رہا۔ جو خاندان قابض ہوا، اسکو قیدیوں اور دعویداروں کی طرف سے ہمیشہ کھٹکا رہا۔ پس جبکہ خلافت اہل عرب کے ہاتھ میں تھی، تورہ کیسے گوارا کر سکتے تھے کہ عجمیوں کے دلوں کی اس بارے میں جرأت افزائی کی جائے؟ اور عرب میں سے بھی جب خاص خاندان قریش میں تھی جو ہر طرح سیادت و بزرگی رکھتا تھا، تورہ کیسے پسند کر سکتے تھے کہ غیر قرشی خلافت کا وجود تسلیم کرے غیر قرشیوں کو ہمتیں دلائی جائیں اور مادی طاقت کے ساتھ شریعت کی حمایت کا سہارا بھی انہیں حاصل ہو جائے؟ بخاری کی روایت میں پڑھچکے ہو کہ امیر معاویہ نے قحطانی پادشاہ کے ظہور کی روایت سنی تو کس درجہ مضطرب اور غضب ناک ہوئے؟ اور کس طرح فوراً قریش والی روایات کا اعلان کر دیا تاکہ پہلے ہی سے سد باب ہو جائے؟ جن علماء کے اقوال پر متاخرین فقہاء و متکلمین کا اعتماد ہے، وہ سب کے سب بھی ہیں جنکا ظہور اواخر عہد عباسیہ میں ہوا ہے جب قرشی خلافت قائم تھی۔ مثلاً قاضی عیاض و امام نواری وغیرہم۔ پس وقت کی حکومت کا جو پولیٹیکل اثر سب پر پڑ رہا تھا، وہ بھی یہی تھا کہ خلافت کو حکمران خاندان کی قوم اور خاندان سے مخصوص سمجھا جائے اور تمام ایسی باتوں میں جس میں اجتہاد و رائے کو دخل ہو، فکر و قیاس کا میلان قدرتی طور پر ایسی جانب ہو جائے۔ علی الخصوص جبکہ اسکے لیے کسی غلط بیانی یا تحریف احکام کی ضرورت نہ تھی۔ واقعی احادیث موجود نہیں۔ صرف مفہوم کے تعبیر میں اجتہاد کو کام کرنا تھا۔ اسی مسئلہ پر موقوف نہیں، وقت کے پولیٹیکل اثرات بے شمار چیزوں میں اندر ہی اندر کام کر چکے ہیں، اور آج انکا پتہ لگانا بہت دشوار ہو گیا ہے۔ ساتویں صدی ہجری میں جب عربی خلافت کا خاتمہ ہو گیا، تو آہستہ آہستہ اس اثر سے افکار خالی ہونے لگے، اور بتدریج بعض و نظر کی صورت دوسری ہو گئی۔ حافظ عسقلانی اور قاضی عینی جو آٹھویں صدی میں بخاری کی شرح لکھ رہے ہیں، انکے مباحث پڑھتو قاضی عیاض اور نواری سے انکار رنگ مختلف نظر آئیگا۔ قاضی عینی تو صاف صاف بھی کہنا چاہتے ہیں جو ہمارا بیان ہے اگرچہ اُسپر زیادہ زور نہیں دیتے۔

بخاری کی حدیث معاریہ ” ما اقاموا الدین “ کی شرح میں لکھتے ہیں
 ” اسی مدۃ اقامتہم امور الدین - قیل یحتمل ان یكون مفعولہ فاذا لم یقیمہ
 لا یسمع لہم “ یعنی یہ جو حدیث میں ہے کہ ” جب تک دین قائم رکھینگے “
 تو اسکا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ جب وہ رقت آجائے کہ قریش اقامت
 دیں نہ کریں تو انکی بات نہیں سنی جائیگی -

غرضکہ جہاں تک تمام احادیث و دلائل پر نظر ڈالی جاتی ہے ، اشتراط
 قرشیۃ کیلئے کوئی نص موجود نہیں ، اگرچہ بصورت اشتراط بھی موجودہ
 مسئلہ خلافت پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا - موجودہ مسئلہ انتخاب امام کا نہیں
 ہے - امام قائم و نافذ کی امامت و اطاعت کا ہے -

(چند لمحات تاریخیہ)

اب بہتر ہوگا کہ تعریفی دیر کیلئے ہم آگے بڑھنے سے رک جائیں ، اور
 چند لمحوں کے لئے گزشتہ ٹیرہ صدیوں کی طرف متوجہ دیکھیں کہ خلافت
 اسلامیہ کے مختلف دوروں کا کیا حال رہا ہے ؟

” الخلافة بعدی ثلاثین سنة “ (میرے بعد خلافت خاصہ ۳۰ برس تک
 رہیگی) کی خبر کے مطابق خلفاء راشدین کا دور ۳۰ - برس تک رہا -
 سنہ ۱۱ - ہجری سے شروع ہوا ، اور ٹھیک سنہ ۴۱ - تک باقی رہا - اسی
 سنہ سے بنو امیہ کی خلافت کا دور شروع ہوتا ہے اور سنہ ۴۱ - ہ سے سنہ
 ۱۳۲ - ہ تک قائم رہتا ہے - اسکے بعد خلافت نے ایک نیا ورق اُلٹا ،
 اور خاندان عباسیہ کا سلسلہ شروع ہوا - خلافت کا سب سے بڑا سلسلہ یہی
 ہے جو سنہ ۱۳۲ - سے ۶۵۶ - ہ تک قائم رہا - چونکہ کامل پانچ صدیوں
 تک حکمرانی ایک ہی گھرانے میں رہی ، اسلئے وہ تمام ذہنی و جسمانی
 اور اجتماعی و مدنی فسادات کمال درجہ تک پیدا ہو گئے ، جو ہمیشہ
 امتداد سلطنت و عروج تمدن کے لازمی نتائج رہے ہیں - قریش کی نسبت
 فرمایا تھا ” ما اقاموا الدین “ جب تک وہ دین قائم رکھینگے ، حکومت
 انہی میں رہیگی - سراب ٹھیک ٹھیک وہ رقت آ گیا تھا - فردش و عرب
 میں دین قائم رکھنے کی صلاحیت مفقود ہو گئی تھی - قیام دین کا
 کام دوسری قومیں اور طاقتیں انجام دے رہی تھیں - پس رہی ہوا
 جو تاریخ عالم ہر ایسے زمانے میں دھراتی آئی ہے - سنہ ۶۵۶ - میں
 ہلاکو خاں نے بغداد پر حملہ کیا اور آخری خلیفہ عباسی المستعصم

بالہ کے خون نے بہکر ہمیشہ کیلیے عربی قرشی حکومت کے خاتمہ کا اعلان کر دیا - مستعصم کا قتل عربی خلافت کا قتل تھا :- (۱)

وما کان قیس ہلکۃ ہلک واحد
ولکنہ بنیان قوم تہدما !

یہ سب کچھ ہو چکا ، مگر ابھی پیشین گوئی کی ایک آخری سطر باقی تھی - یعنی ”ما بقی منہم انان“ قریش سے حکومت نکل جائیگی - پر نکل جانے پر بھی آنکی عظمت رفتہ کا یہ اثر باقی رہیگا کہ اگر در قرشی بھی کسی گوشہ میں نکل آئینگے تو لرگ خلافت کا انہی کو مستحق مانینگے - بغداد میں قرشی خلافت مٹی ، لیکن مٹتے مٹتے بھی ایک آخری نقش چھوڑ گئی - وہ بغداد کی خون آلود خاک سے اکھڑا اور تین سو برس تک کیلیے مصر میں جا کر جم گیا - البتہ یہ جماؤ قرشی حکومت کا جماؤ نہ تھا - محض اُسکے نقش قدم کا تھا :

گر کہ ہم صفحہ ہستی پہ تے ایک حرف غلط
لیکن آتے بھی تو ایک نقش بٹھا کے آتے !

عباسی خاندان کے دربار آدمی بغداد کے قتل عام سے بچکر نکل گئے تھے - انہی میں مستعصم کا چچا احمد بن ظاہر عباسی بھی تھا - وہ سنہ ۴۹۰

(۱) فتنہ تاتار کا ظہور مسلمانوں کیلیے وہی معاملہ تھا جو بنی اسرائیل

کیلیے بخت نصر کا ظہور - ثم بعثنا علیکم عباداً لنا اولى باس شدید - فحاسوا خلال الدار - و کان وعداً مفعولاً (۱۷ : ۶) بحکم ”یأنی علی امتی ما اتی علی بنی اسرائیل حذر النعل بالنعل“ (صحیحین) اس امت پر بھی وہ سب کچھ گذرنے والا ہے جو بنی اسرائیل پر گزر چکا - بنی اسرائیل پر غفلت و ضلالت کے دو سب سے بڑے دور آئے - اس لیے دو ہی مرتبہ عام بربادی بھی جھانپی : وقضینا الی بنی اسرائیل فی الکتاب لنفسدن فی الارض مرتین و لتعلن علواً کبیرا (۱۷ : ۵) پہلی بربادی بخت نصر کے ہاتھوں ہوئی : عباداً لنا اولى باس شدید - ارر دوسری قیصر روم کے ہاتھوں - معلوم ہوتا ہے کہ اسی طرح اس امت کیلیے بھی دو انقلاب لگے گئے - ایک فتنہ تاتار - دوسرا فتنہ یورپ - پہلا ہو چکا - دوسرا ہو رہا ہے -

میں مصر پہنچا - وہاں ایروپی خاندان کے ممالیک کی حکومت قائم تھی اور ملک ظاہر بیبرس حکمران تھا - اسکو احمد کے خاندان کا حال معلوم ہوا تو منصب خلافت کا حقدار اُسی کو تسلیم کیا اور خود اُسکے ہاتھ پر بیعت کر لی -

احمد بن ظاہر نے المستنصر باللہ کا لقب اختیار کیا اور بیبرس کی معیت و اعانت میں چاہا کہ دار الخلافۃ بغداد کو تاتاریوں کے تسلط سے نجات دلاے - لیکن کامیابی نہ ہوئی اور لڑائی میں شہید ہوا - اب پھر وہ وقت آگیا تھا کہ قریش سے خلافت کا انساب بالکل معدوم ہو جائے ، لیکن ” ما بقی منهم ائذان “ کی پیشین گوئی آخر تک اپنے عجائب دکھلانے والی تھی - قتل عام بغداد سے ایک اور عباسی ابو العباس احمد بن علی بھگرنکل گیا تھا اور حلب میں مخفی تھا - اُسکا حال بیبرس کو معلوم ہوا تو برے اعزاز و اکرام سے مصر لایا اور اُسکے ہاتھ پر بیعت کر لی - حاکم بامر اللہ لقب قرار پایا - اسی کی نسل میں مصر کی عباسی خلافت ۲۹۱ - برس تک قائم رہی - یعنی سنہ ۴۶۰ ھ سے سنہ ۹۲۳ ھ تک - اس عرصہ میں عالم اسلامی در صدیوں تک طرح طرح کے انقلابات و حوادث سے تہہ و بالا ہو کر بالآخر ایک نئے دور میں منتقل ہو چکا تھا - عثمانی ترکوں کی حکومت قسطنطنیہ میں قائم ہو کر یورپ و ایشیا کے اندر ہر طرف پھیل رہی تھی - سنہ ۶۳۹ ھ - (۱۵۱۷ - مسیحی) میں سلطان سلیم خان ارل نے مصر و شام پر قبضہ کیا ، اور آخری عباسی خلیفہ المتوکل نے اُسکے ہاتھ پر بیعت کر کے تمام حقوق و امتیازات خلافت سپرد کر دیے - اختیار و حکومت کے علاوہ جو چیزیں اس سلسلہ میں سلطان سلیم کو دی گئیں ، ان میں سب سے بڑی چیز مقامات مقدسہ و حرمین کی کنجیاں تھیں ، اور بعض آثار قدوہ - مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار - جھنڈا - ایک چادر - یہ آثار اس وقت تک قسطنطنیہ میں بطور سند خلافت کے موجود ہیں - اسی تاریخ سے عثمانی سلاطین نمایاں طور پر ” خلیفہ “ کے لقب سے دنیا میں مشہور ہوئے ، اور حجاز اور مصر و شام کے مذہبوں پر انکا ذکر بہ حیثیت امیر المومنین کے ہونے لگا - حج کی امارت بھی انہی کے قبضہ میں آگئی جو شرعاً خلافت کے اہم ترین فرائض میں سے ہے -

سلسلہ خلافت کی یہ ایک مجمل تاریخ ہے - بالفرض خلیفہ متوکل عباسی نے سلطان سلیم کے ہاتھ پر بیعت نہ کی ہوتی ، جب بھی آئندہ پیش آنے والے واقعات کا قدرتی نتیجہ یہی تھا کہ تمام عالم اسلامی کی

خلافت کا منصب عثمانی سلاطین ہی کے قبضہ میں آجائے - رقت کی جو اسلامی سلطنت سب سے بڑی اور سب سے زیادہ شرع و ملت کی حفاظت کی طاقت رکھتی ہو، رہی شرعاً خلافت کا منصب رکھ سکتی ہے - گذشتہ چار صدیوں کے اندر اسلامی حکومتوں کے انقلابات کا جو حال رہا ہے، آنکھ دیکھتے ہوئے کہہ سکتا ہے کہ یہ حق بجز اس سلطنت کے اور کسی سلطنت کو مل سکتا تھا؟ خود ہندوستان میں سلاطین مغلیہ کی حکومت قائم تھی - وہ ہندوستان کے اندر اپنے ہی کو امام سمجھتے تھے، لیکن عالم اسلامی کی خلافت کا انہیں کبھی وہم و خیال بھی نہیں گزرا، اور اگر گزرتا تو دنیا ماننے کیلئے طیار نہ تھی - ابتدا سے لیکر آخر تک مقام خلافت کی جو عام و مشترک خصوصیات رہی ہیں اور جنکو تمام دنیا کے مسلمانوں نے عملاً علائم خلافت تسلیم کر لیا ہے، وہ خلفاء عباسیہ کے بعد صرف عثمانی سلاطین ہی کو حاصل ہوئیں - کوئی دوسری اسلامی حکومت اس عام اقتدار و اختیارات کے ساتھ قائم نہ ہو سکی -

(خلافت و امامت سلاطین عثمانیہ)

اس عارضی وقفہ کے بعد اب ہم پھر آگے بڑھتے ہیں - سلطان سلیم خان اول کے عہد سے لیکر آج تک بلا نزاع سلاطین عثمانیہ ترک تمام مسلمانان عالم کے خلیفہ و امام ہیں - ان چار صدیوں کے اندر ایک مدعی خلافت بھی اُنکے مقابلہ میں نہیں آتا - بنو امیہ اور عباسیہ کے عہدوں میں بے شمار رقبوں اور دعوی داروں کی کشمکش نظر آتی ہے، لیکن سلاطین عثمانیہ کی خلافت کی پوری تاریخ میں کسی ایک مدعی خلافت کا نام بھی نہ ہونڈھکر نہیں نکالا جاسکتا - حکومت کے دعوی دار سیکڑوں آئے ہوں، مگر اسلام کی مرکزی خلافت کا دعویٰ کوئی نہ کر سکا -

صدیوں سے اسلام و بلاد اسلام کی حفاظت کی تلوار صرف انہی کے ہاتھوں میں ہے - صدیوں سے صرف انہی کا سینہ اسلام کی راہ میں زخمی ہے، صرف انہی کی لاشیں اسلام کیلئے خاک و خون میں تڑپتی ہیں، صرف انہی کی ذمہ داری پر تمام کرۂ ارضی کے مسلمانوں نے اسلام کی مرکزی حفاظت کا کاروبار چھوڑ رکھا ہے - دنیا کے خواہ کسی گوشے میں کوئی مسلمان ہو، اگر وہ بہ حیثیت ایک مسلمان کے اسلام کا چوتھا رکن حج ادا کرنے کیلئے نکلتا ہے، تو عرفات کے میدان میں کھڑے ہو کر اسکو

عثمانی امامت کی دینی ریاست قبول کرنی پڑتی ہے اور حج کا فریضہ عثمانی خلیفہ ہی کے بھیجے ہوئے نائب کے ماتحت انجام دینا پڑتا ہے۔ شریف حسین نے غیر مسلم محاربین کا ساتھ دیکر اگر بغارت کی اور حجاز کو قسطنطنیہ کے اقتدار حکومت سے الگ کر لیا، تو یہ بغارت فساد کی ایک عارضی حالت ہے جو شرعاً معتبر نہیں۔ حجاز حکماً اب بھی خلیفہ قسطنطنیہ کی حکومت ہی کا ایک جزء ہے۔ اور تمام مسلمانان عالم کا شرعاً فرض ہے کہ حرمین شریفین کو باغیوں کے تصرف سے نکالنے کی کوشش کریں، اور اس وقت تک کرتے رہیں جب تک بغارت اور باغیوں کا بالکل استیصال نہ ہو جائے۔ نہ کریں گے تو ہر مسلمان اس کے لئے عند اللہ جوابدہ ہوگا۔

تمام کرۂ ارضی کے مسلمان آرام و عیش کے دن بسر کرنے اور فارغ البالی کے بستر پر سونے کیلئے ہیں، لیکن صرف وہی ایک ہیں جو سارے مسلمانوں کی عزت و زندگی کے بچاؤ کیلئے صدیوں سے تلواروں کے سایے میں دن رات رہے ہیں، اور چاروں طرف سے دشمنوں کی زد میں ہیں۔ ایک چوتھائی صدی بھی آج تک انہیں ایسی نہیں ملی کہ آرام و چین سے بیٹھ سکے ہوں۔ انکا جرم اس کے سوا کچھ نہیں کہ جب اسلام کا محافظ دنیا میں کڑی نہ رہا۔ ساری تلواریں توت گئیں۔ سارے بازار شل ہو گئے۔ تو پانچ صدیوں سے وہ کیوں اسلام کے بچاؤ کیلئے باقی ہیں؟ کیوں وہ وقت نہیں آئے دیتے کہ اسلام کی پولیٹیکل طاقت کا بالکل خاتمہ ہو جائے؟

بے درستی — و خصوصاً عالمی با من

ہزار دشمن و یک دوست مشکل افتاد است !

پس تیرہ سو برس کے متفقہ عقیدہ و عمل کے مطابق وہی آج تمام مسلمانان عالم کے خلیفہ و امام اور ”ارلو الامر“ ہیں۔ انکی اطاعت و حمایت اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت و حمایت ہے۔ اُن سے پھرنا اور انکو اپنے جان و مال سے مدد نہ دینا، اللہ اور اس کے رسول سے پھرنا اور اللہ اور اس کے رسول کو اپنی جان و مال کے طرف سے صاف جواب دہ دینا ہے۔ جو انکی اطاعت سے باہر ہو، اگرچہ صرف بالشبت بھر باہر ہو، اور اسی حالت میں مر گیا، تو اُسکی موت اسلامی زندگی کی موت نہ رہی بلکہ جاہلیہ کی۔ اگرچہ نماز پڑھتا ہو، اگرچہ روزہ رکھتا ہو، اگرچہ اپنے زعم باطل میں اپنے تئیں مسلمان سمجھتا ہو۔ جس نے اُنکے مقابلہ میں تلوار اٹھائی، وہ مسلمانوں میں سے نہیں اگرچہ دنیا اُسکو مسلمانوں

میں سے سمجھتی ہو۔ اللہ اور اللہ کے رسول کی شہادت، اُسکی شریعت کی آن گزشت اور بے شمار دلیلیں، ایک ہزار تین سو برس سے مانا ہوا اسلام کا حکم و عقیدہ، اسلام کی سیکڑوں نسلوں اور لا تعداد گہرائیوں کا تعامل و اجماع اور سورج کی کرنوں کی طرح یقینی اور قطعی حقیقت، یہی بتلا رہی ہے۔ ایک مسلمان کیلئے (بشرطیکہ وہ ساری باتوں سے مقدم اپنے اسلامی تعلق کو سمجھتا ہو، اور دنیا سے ایک مومن اعتقاد و عمل ساتھ لے جانا چاہتا ہو) اس میں کسی طرح کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ جاہل سے لیکر عالم تک، ایک موزوں سے لیکر نظام دکن تک، مسلمانوں کے ایک ایک فرد، ایک ایک بچے کے دل پر یہ اعتقاد اس طرح کھدا ہوا ہے کہ تکرار کی ٹوک سے بھی چھپلا نہیں جاسکتا۔ یہ بہت ممکن ہے کہ دنیا کی چند روزہ زندگی کا عشق اور انسانی طاقتوں کا خوف کسی زبان کو گونگا یا کسی ہاتھ کو شل کر دے۔ لیکن ہندوستان میں ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک دل ایک بھی ایسا نہیں مل سکتا جو اس اعتقاد میں تمام مسلمانوں کا شریک نہ ہو۔ زندگی کا عشق اور دنیوی تکلیفوں کا غم جس انسان سے چوری کرتا ہے، داکے دلواتا ہے، قتل کرتا ہے، دل کے خلاف ہزاروں دعوؤں سے، اور اعتقاد و ضمیر کے خلاف لاکھوں اقراروں سے اُسکا حلق و دھن بھر دیتا ہے، اُس انسان سے کیا بعید ہے کہ آج کسی طمع یا خوف سے عثمانی خلافت کا انکار کر دے، یا عثمانی خلیفہ کی اطاعت و حمایت کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرنے لگے؟ دنیا کی پوری تاریخ انسانی کمزوریوں کی ایک نم آلود اور ندامت انگیز داستان ہے۔ پس جہاں انسانی کمزوری کی بے شمار مثالیں اُسکے ہر عہد و باب میں ملتی ہیں، وہاں آج چند مثالوں کا اضافہ آدرسہی۔ لیکن حقیقت ہر حال میں حقیقت ہے۔ اُس سے انکار کیا جاسکتا ہے لیکن چھپایا نہیں جاسکتا۔ اُس سے اغماض کیا جاسکتا ہے، لیکن اُس کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ آج مسلمانوں کیلئے اس سے بڑھکر بدبختی کی کوئی ماتم انگیز مثال نہیں ہو سکتی کہ ایک ایسی سچائی کے اثبات کیلئے دلیلوں کی تلاش ہے اور بحث و نظر کی ضرورت۔ اگر ایسی مسلم و معروف باتوں کیلئے بھی دلائل و اثبات کی ضرورت ہے، تو شاید وہ وقت آ گیا جب توحید کے عقیدہ کو اسلامی عقیدہ ثابت کرنے کیلئے فترے لکھوائے پڑینگے، اور کتابیں چھاپکر شائع کرنی پڑینگیں!

فان کنت لا تدري ، فتلک مصیبة

وان کنت تدري ، فالمصیبة اعظم !

میں یہاں قصداً ترکوں کی سیاسی و تمدنی لیاقت و نالائقی کی بحث نہیں چھیڑنا - یہ ہمیں معلوم ہے کہ مسلمانوں کی تمام حکمران جماعتوں میں ترکوں ہی کی جماعت رہ جماعت ہے ، جسکے لیے کوئی یورپیوں دماغ منصف نہیں ہو سکتا - یورپ کا مورخ ہو ، خواہ موجودہ عہد کا کوئی مدبر ، وہ گذشتہ عہد کے بدتر سے بدتر مسلمانوں کی مدح و توصیف کر سکتا ہے جواب موجود نہیں ہیں ، لیکن ان ترکوں کی نہیں کر سکتا جنکی تلواریں پانچ صدیوں سے یورپ کے دل و جگر میں پبوست ہونے کیلئے زندہ موجود ہیں - وہ بنو امیہ کی خلافت کی ایک بہتر تاریخ لکھ سکتا ہے - عباسیہ کے در علم و تمدن کی مدحت سرائی کر سکتا ہے - صلاح الدین ایوبی تک کو ایک بت کی طرح پوج لے سکتا ہے جسکی تنہا تلوار شام و فلسطین میں یورپ کے متحدہ مسیحی جہان (کروسیڈ) کا مقابلہ کرتی رہی ، لیکن وہ ان ترکوں کیلئے کیونکر انصاف کر سکتا ہے جو نہ تو عرب پر قاع رہے ، نہ ایران و عراق پر - نہ شام و فلسطین کی حکومت انکو خرش کر سکی ، نہ وسط ایشیا کی ، بلکہ تمام مشرق سے بے پرا ہو کر یورپ کی طرف بڑھے ، اسکے عین قلب (قسطنطنیہ) کو مسخر کر لیا ، اور اُسکی اندرونی آبادیوں تک میں سمندر کی موجوں کی طرح در آئے - حتیٰ کہ دار الحکومت استنبول کی دیواریں اُنکے جوالں قدم کی ترکنازیوں سے بارہا گرے گرے بچ گئیں !

ترکوں کا یہ رہ جرم ہے جو کبھی یورپ معاف نہیں کر سکتا - مسلمانوں کا کوئی موجودہ حکمران خاندان اس جرم (فاجعہ یورپ) میں اُنکا شریک نہیں - اسلیئے ہر حکمران مسلمان اچھا تھا جو یورپ کی طرف متوجہ نہ ہو سکا ، مگر ہر ترک وحشی و خونخوار ہے اسلیئے کہ یورپ کا طلسم اُسکی شمشیر سے ٹوٹ گیا - ترکوں نے پانچ صدیوں تک جس آزادی و عدالت گستری کے ساتھ حکومت کی ہے ، اُسکا ثبوت اس سے بڑھ کر دیا ہو سکتا ہے کہ چار صدیوں کی متصل حکمرانی کے بعد بھی محکوم عیسائیوں کی مذہبی و قومی عصبیت ایسی زندہ و ترانا رہی کہ خرد کسی مسیحی حکومت کے ماتحت نہیں رہ سکتی تھی - حتیٰ کہ وہ ترکوں کی کمزوری کے ساتھ ہی آزاد و خرد مختار ہو گئے - ہندوستان میں برٹش گورنمنٹ کے پورے تسلط کو ابھی پورے سر سال بھی نہیں ہوئے ہیں - اِنہ ہی عرصہ کی حکومت نے ہندوستان



میں قومی عظمت و عصبیت کے جذبات ان لوگوں کے دلوں سے بھی کھینچ لیے جنکے آباء اجداد ساٹھ ستر برس پہلے اسی سر زمین میں حکمران تھے - صرف یہی ایک چیز یورپ کے طرز حکومت، اور ترکوں کے طرز حکومت کا فرق واضح کر دینے کیلئے کافی ہے - ترکوں کے وہم و خیال میں بھی ظلم و خونخواری کی وہ ہیبت ناک صورتیں اور قومی تعصب و نفرت کی وہ وحشت ناک ہلاکیاں نہیں آسکتیں، جو یورپ کے تمدن و تہذیب کا مغرور بت عین آنیسویں اور بیسویں صدی کے سورج کی روشنی میں ایشیاؤ افریقہ کے اندر کرچکا ہے - ان دو صدیوں کے اندر جنگل کے دندے آرام کی نیند سوئے، اور سانپوں کو آنکھیں غاروں سے باہر نہیں نکالا گیا، لیکن ایشیاؤ افریقہ کیلئے یورپ کے ہاتھوں زمین کا ایک ٹکڑہ بھی ایسا نہ بچ سکا جسکو وہاں کی بد بخت مخلوق اپنی زمین کہہ سکے، اور جہاں ایک مالک و مختار کی طرح امن و عزت کی زندگی بسر کر سکے! خود اسی آخری جنگ میں یورپ کے ہر دندے نے دوسرے دندے کو جس طرح پھاڑا، اور ہر سفید بھیڑیے نے دوسرے سفید بھیڑیے پر جس طرح پنجہ مارا، نہ صرف ترکوں کی تاریخ بلکہ تمام ایشیا کی تاریخ ریسی وحشت اور شرمناک دندنگی کی مثال پیش نہیں کر سکتی - با ایں ہمہ ترک خونخوار اور وحشی ہیں، اور یورپ تہذیب و تمدن اور امن و رحم کا پیغمبر! علی الخصوص برطانیہ کے مقدس جزیرہ میں تو جسد فرشتے بستے ہیں، وہ صرف انسانی آزادی کی حفاظت اور چھوٹی قوموں کی حمایت ہی کیلئے آسمان سے اُتارے گئے ہیں! یہ کرۂ ارضی کی تاریخ میں حق و باطل کا سب سے بڑا مقابلہ ہے - آج اسکی فتح و شکست کا اصلی فیصلہ نہیں ہو سکتا - زمین فوجوں کے بوجھ سے دبے ہوئی ہے - فضاء ہوائی جہازوں کی قطاروں سے بھری ہوئی - اسکا فیصلہ کل ہوگا جب خدا کا دائمی قانون نتائج و عواقب کی زبان میں حقیقت کا اعلان کریگا، اور مورخ کا قلم لکے گا کہ یہ طاقت اور گھمٹ کا سب سے بڑا چیلنج تھا جو سچائی کو دیا جا سکتا ہے - تاہم سچائی ہی سب سے بڑی طاقت ہے - اور بالآخر فیصلہ اُسی کا فیصلہ ہے - سَئَةُ اللّٰهِ فِي الدِّينِ

خَلَا مِنْ قَبْلِ، رَانَ تَجَدُّ لِسَةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا (۳۳: ۲۲) ۲۳۲

بہر حال ہماری صحبت سے یہ موضوع باہر ہے - ترکوں کی حکمرانی چپسی کچھ بھی رہی ہو - ہر ترک سلطان حجاج بن یوسف اور خالد قسری

جیسے اشرف بنو امیہ سے بھی بدتر کیوں نہ رہا ہو (۱) لیکن مسلمانوں کو اپنے مسلمان حاکموں کی اطاعت کا ہر حال میں حکم دیا گیا ہے - اور اُنکا از روئے شرع یہی عقیدہ ہے کہ وہ خلیفۃ اسلام ہیں - اسمیں کسی دوسرے کو دخل دینے کا حق نہیں :

(۱) جبکہ آج ترکوں کی وحشت و تمدن کا فیصلہ علم و تحقیق کے ہاتھ میں نہیں ہے - حریف حکومتوں کے اُن مغرور وزراء کے قبضہ میں ہے جو میدان جنگ سے واپس آکر اپنے ایک جنگی دشمن کی قسمت کا فیصلہ کرنے بیٹھے ہیں ، تو اُمید نہیں دریپر (Draper) جیسے زمانہ حال کے مورخوں کی شہادت اس بارے میں سنی جائے - یہ امریکن مصنف اپنی مشہور کتاب History of The Conflict Between Religion And Science میں لکھتا ہے کہ انصاف و عدالت اور مذہبی بے تعصبی میں اپنے عہد کی تمام عیسائی دنیا پر ترکوں کو بھی فوقیت رہی ہے جو چھٹی صدی عیسوی میں عربوں کو تنزل یافتہ یوزنطائن کے مقابلے میں تمام یورپ پر حاصل تھی - ایڈورڈ کریسی نے تاریخ روم میں ترکوں کو تہذیب و تمدن اور علمی ایجادات و اختراعات کے لحاظ سے پندرھویں اور سولہویں صدی کے تمام یورپ میں سب سے برتر قوم تسلیم کیا ہے - وہ کہتا ہے کہ انسائیکلو پیڈیا کے قسم کی کتابیں لکھنے کا یورپ میں ترکوں ہی کی تقلید سے رواج ہوا - یورپ کی زبانوں میں سب سے پہلی انسائیکلو پیڈیا ڈالامبرٹ (D'alambert) نے لکھی - لیکن ایک ترک مصنف کلبی بے کی فاموس العلوم ہی کے مطالعہ سے اسکو رھنمائی ملی تھی - کمسریٹ ' رسد رسائی ' فوجی شفا خانوں کا باقاعدہ انتظام ' ترکوں ہی سے یورپ نے سیکھا - قلعہ کی تعمیرات میں تمام یورپ ترکوں کا شاگرد ہے - فوجی باجا تمام یورپ نے ترکوں ہی سے حاصل کیا - چیچک کے تیکہ کا اصلی موجد ایک ترک تھا - یہ دریپر ' کریسی ' اور کنگڈم کلفرڈ وغیرہ مورخوں کی تحقیق ہے جنہوں نے اپنے کتب خانوں میں بیٹھ کر ترکوں کے اعمال پر نظر ڈالی تھی - قدرتی طور پر مسٹر ایسکوویٹھ اور مسٹر لائڈ جارج کی رائے اس سے مختلف ہونی چاہیے جو ابھی ابھی گیلی پولی اور عمارہ میں ترکوں کی تلوار کا کاری زخم کھا کر نکلے ہیں ' اور میدان جنگ سے واپس آکر کتب خانوں کی جگہ نظارت خانوں کے اندر فیصلہ کرنے بیٹھے ہیں !

نمی دانم ز منع گریہ مطلب چیست ناصح را ؟
دل از من ، دیدہ از من ، آستین از من ، گذار از من !

جب تک بغداد کی خلافت باقی رہی ، ہندوستان کے تمام حکمران خاندان اسی کے زیر اثر اور فرمانبردار رہے - عباسیہ بغداد کی خلافت جب مت گئی ، اور سنہ ۲۶۰ ھ میں مصر کی عباسی خلافت کا سلسلہ شروع ہوا ، تو اگرچہ یہ عباسیہ کے کاروان رفتہ کا محض ایک نمود غبار تھا ، تاہم تمام سلاطین ہند اس کی حلقہ بگوشی و غلامی کو اپنے لیے موجب صد فخر و امتیاز سمجھتے رہے اور مرکزی خلافت کی عظمت دینی نے مجبور کیا کہ اپنی حکومت کو شرعی طور پر منوادینے کیلئے مقام خلافت سے پررائہ نیابت و امارت حاصل کرتے رہیں - سلطان محمد بن تغلق شاہ کے غرور حکومت کا یہ حال تھا کہ ضیاء الدین برنی اسکو ”ہمت فرعون و نمرونی“ سے تعبیر کرنا چاہتا ہے - تاہم اس معاملہ میں زیادہ سے زیادہ غرور جوڑہ کرسکا ، یہی تھا کہ اپنے تئیں خلیفہ مصر کا زیادہ سے زیادہ فرمانبردار غلام اور چاکر ظاہر کرے ، اور کہے کہ بلا اس کے حکم کے میں تم پر حکومت نہیں کرسکتا - تاریخ برنی میں ہے :

”امیر المومنین خلیفہ را بندہ ترین ہمہ بندگان بود ، و بے امر و بے فرمان او دست در امور اولو الامری نہ زد“ (مطبوعہ ایشیائیک سوسیٹٹی - صفحہ ۱۶۰)

برنی نے سلطان فیروز شاہ کے فضائل و سوانح کیلئے گیارہ مقدمے ترتیب دیے ہیں - ان میں نوراں مقدمہ یہ ہے ”مقدمہ نہم در آنکہ دورکت از حضرت امیر المؤمنین خلعت اولو الامری و منشور اذن و لواء شاہی بر سلطان عصر فیروز شاہ رسیدہ ، و بادشاہی و اولو الامری خداوند عالم بدان استحکام گرفتہ“ پھر اس مقدمہ میں لکھتا ہے ”در مدت شش سال دورکت از امیر المومنین منشور اولو الامری و خلعت شاہی و لواء سلطنت بدر رسید ، و حق جل و علی پادشاہ دین پرور ما را در عزت داشت منشور و خلعت و فرستادگان توفیق بخشید ، و شرائط حرمت مراحم امیر المؤمنین بالغاً ما بلغ بجا آورد ، و ہم چنین دانست کہ منشور و خلعت امیر المؤمنین از آسمان منزل شدہ ، و از درگاہ مصطفی صلعم رسیدہ - عرضداشتہ با تحفہ و ہدایا در نہایت تواضع بندگی امیر المؤمنین رزان کرد“ الخ (صفحہ ۵۹۸۰)

یعنی سلطان فیروز شاہ کے فضائل و مفاخر میں سے ایک بڑی بات یہ سمجھی گئی کہ خلیفہ مصر نے اجازت حکومت کا پرراناہ اور لواء و خلعت بھیجا، اور پادشاہ کو اسکی اطاعت و حرمت کی توفیق ملی۔ فیروز شاہ نے اس بات کی اس درجہ قدر کی گویا آسمان سے یہ عزت نازل ہوئی ہے، اور خود بارگاہ حضرت محمد الرسول اللہ صلعم سے اسکو قبولیت کی سند ملگئی ہے! شمس الدین سراج عقیف نے تاریخ فیروز شاہی میں یہ واقعہ زیادہ تفصیل سے لکھا ہے۔ جب خلیفہ کے سفراء شہر سے قریب پہنچے تو فیروز شاہ خود استقبال کیلیے پیدل نکلا۔ فرمان خلافت کو دونوں ہاتھوں میں لیا۔ پھر بوسہ دیکر سر پر رکھا، اور اسی طرح سر پر دھرے ہوئے دربار حکومت تک واپس آیا۔

غور کرو! مقام خلافت کی عظمت کا ہمیشہ کیا حال رہا؟ خلافت بغداد کے مٹنے کے بعد بھی خلافت کی صرف ایک اسمی نسبت اس درجہ ہیبت و جبروت رکھتی تھی کہ ہندوستان جیسے بعید گوشہ میں ایک عظیم الشان فرماں رواے اقلیم مصر کے دربار خلافت سے ان و اجازت حاصل ہو جانے پر فخر کرتا ہے۔ مٹنے پر بھی اس مقام کی عظمت تمام عالم اسلامی پر اس طرح چھائی ہوئی ہے کہ وہاں کا فرمان آسمانی فرمان، اور وہاں کا حکم بارگاہ نبوت کا حکم سمجھا جاتا ہے!

مغلیہ سلطنت خلفاء مصر کے آخری عہد میں قائم ہوئی۔ ہندوستان میں شہنشاہ اکبر کا زمانہ تھا جب سلطان سلیم خاں کے ہاتھ پر خلیفہ متوکل عباسی نے بیعت کی اور حجاز و شام میں سلاطین عثمانیہ کی خلافت کا اعلان ہوا۔ شاہان مغلیہ اگرچہ ہندوستان میں خود اپنے ہی کو امام سمجھتے تھے، اور باعتبار حکومت کے یہ حق انہیں حاصل بھی تھا۔ تاہم عام اسلامی خلافت کا انہوں نے کبھی دعوا نہ کیا۔ ہمیشہ عرب و شام کے مسلمہ خلفاء ہی کو خلیفہ تسلیم کرتے رہے۔ خود شہنشاہ اکبر اور شاہجہاں بھی اگر حج کیلیے مکہ جاتے، تو وہاں انکو قسطنطنیہ کے خلیفہ ہی کی امارت میں حج ادا کرنا پڑتا۔ میدان عرفات میں وہ خود خطیب نہ ہوتے۔ قسطنطنیہ کا نائب السلطان خطبہ دیتا رہے کہتے ہوئے اسی طرح سنتے، جس طرح ایک عام مسلمان انکے بغل میں کہتا رہا ہوتا۔ شرعاً و عقلاً تسلیم خلافت کیلیے اس سے زیادہ اور کونسی بات ہو سکتی ہے؟

بعض یورورپین اخبارات کے مشرقی نامہ نگاروں نے بار بار یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ترکی حکومت سے باہر بسنے والے مسلمانوں میں ترکی خلافت کا اعتقاد زیادہ تر سلطان عبد الحمید خاں مرحوم کی سعی سے پیدا ہوا ' اور انکا مقصود اس سے یہ تھا کہ نام نہاد "پان اسلامزم" تحریک کو تمام مسلمانان عالم میں پھیلا دیا جائے۔ یہاں ہم یورپ کے متخیلہ و متروہمہ "پان اسلامزم" کی حقیقت سے بحث کرنا نہیں چاہتے "پان اسلامزم" سے مقصود اگر مسلمانوں کی بلا امتیاز وطن و قومیت باہمی برادری ہے ' تو اسکی تاریخ سلطان عبد الحمید کے زمانے سے نہیں بلکہ نزل قرآن و ظہور اسلام سے شروع ہوتی ہے۔ لیکن عثمانی خلافت کے عالمگیر اسلامی اعتقاد کو سلطان عبد الحمید سے منسوب کرنا ایک ایسی بات ہے جو یا تو حد درجہ جہل کا نتیجہ ہو سکتی ہے یا حد درجہ دروغ گوئی کا۔ اور ہم نہیں جانتے کہ دونوں میں سے کس چیز کو محققین یورپ کیلئے پسند کریں ؟

سنہ ۹۲۳ھ میں جب بعہد سلطان سلیم خاں سلاطین عثمانیہ خلیفۃ المسلمین تسلیم کیے گئے ' تو اسوقت عالم اسلامی کا یہ حال تھا کہ ایران میں سلاطین صفویہ کی حکومت تھی ' ہندوستان میں مغلیہ کی ' اندرون یمن میں آلہ زیدیہ کی ' اور اندرون عرب میں خود مختار قبائل اور بعض شیوخ کی۔ پس جہاں جہاں اسلامی حکومتیں موجود تھیں ' وہاں کے مسلمانوں کی اطاعت و انقیاد کا محل و مرکز خود مقامی اسلامی حکومت ہوگئی تھی ' اور احکام شرعیہ کے نفاذ و اجراء کیلئے بھی وہ کسی بیرونی حکومت کے محتاج نہ تھے۔ ظاہر ہے کہ ان ممالک میں مرکزی خلافت کا تعلق کسی نمایاں شکل میں یکایک ظاہر نہیں ہو سکتا تھا۔ سلطنت کے رقبہانہ جذبات بھی اپنی انتہائی حالت میں سب پر چھائے ہوئے تھے۔ صدیوں پہلے سے تفرقہ و انتشار کی عالمگیر مصیبت تمام عالم اسلامی کو تکرے تکرے کرچکی تھی۔ لیکن ان ممالک کے علاوہ آذر جہاں کہیں بھی مسلمان آباد تھے اور اپنی مقامی اسلامی حکومت نہیں رکھتے تھے ' وہ اگرچہ ترکی حکومت سے کٹنے ہی در دراز گوشوں میں واقع ہوں ' لیکن عثمانی سلاطین ہی کو اسلام کی مرکزی خلافت عظمیٰ پر قابض و متصرف تسلیم کرتے تھے اور اسلئے جمعہ و عیدین کے خطبوں میں انکے لیے خاص طور پر دعا مانگنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ خود ہندوستان کے قرب و جوار اور بحر چین کے جزائر میں مسلمانوں کا ایک ایک فرد خلیفۃ قسطنطنیہ کی اس حیثیت

دینی کا پورا اعتقاد رکھتا تھا - جزائر سیلون ہندوستان ہی کا ایک بحری گوشہ ہیں - سنہ ۱۱۷۵ھ (سنہ ۱۷۶۱ع) میں دکن کے ایک مشہور عالم سید قمر الدین ارزننگ آبادی حج سے واپسی میں کولمبو پہنچے اور وہاں کی سیر کی - میر غلام علی آزاد بلگرامی اُنکے معاصر ہیں - اپنی کتاب سبکۃ المرجان میں اُنکی زبانی نقل کرتے ہیں کہ ساحلی مقامات میں پرتکالیروں کی حکومت ہے - اندرونی جزائر میں ہندو راجہ ہے - کولمبو میں مسلمانوں کے دو محلے ہیں - جمعہ کی نماز تین مرتبہ سید موصوف نے وہاں پڑھی - خطبہ میں امام نے پادشاہ ہند اور سلطان روم کیلئے دعا مانگی - ”لکونہ خادما للحریمین الشریفین“ یعنی اسلئے کہ وہ خادم حرمین ہیں - (سبکۃ المرجان مطبوعہ بمبئی صفحہ ۲۳) یہ اب سے قریب سربس پیشتر کا واقعہ ہے - سیلون کے جزیروں میں اگر مسلمان ایک غیر مسلم حاکم کے ماتحت رہ کر شاہ ہند کا ذکر کرتے تھے تو یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی کہ ہندوستان بالکل اُسے متصل تھا - لیکن قسطنطنیہ کے سلطان کیلئے دعا مانگنا جو بحر ہند سے اسقدر بعید فاصلہ پر واقع ہے کیا معنی رکھتا ہے ؟ کیا اس کے سوا کوئی معنی ہو سکتے ہیں کہ تمام عالم اسلامی میں رہی خلیفۃ المسلمین ہے اور اسلئے گو آدر بھی بہت سی اسلامی حکومتیں دنیا میں موجود ہوں مگر ہر گوشہٴ عالم کے مسلمانوں کے دلی تعلق و اطاعت کا اصلی مرکز صرف وہی ہو سکتا ہے ؟

صاحب تحفۃ العالم چین کوچک کے ایک سیاح سے اپنی ملاقات کا حال لکھتے ہیں جس نے عجیب عجیب جزیروں اور وہاں کے رسم و رواج کا مشاہدہ کیا تھا - ”چین کوچک“ سے مقصود بحر چین کے جزائر سمائرا، ملایا، جارا، وغیرہ ہیں - سیاح مذکور کہتا ہے کہ اکثر جزائر میں مسلمان آباد ہیں - مسجدیں معمور - جمعہ کے خطبوں میں سلطان روم کیلئے دعا مانگتے ہیں اور وہاں کے حالات سے خوب باخبر ہیں - یہ واقعہ بھی بارہویں صدی کے ارائل کا ہے -

باقی رہا یہ خیال کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں سلاطین عثمانیہ کی خلافت کا اعتقاد حال کی پیدوار ہے تو یہ بھی صحیح نہیں - یہ ظاہر ہے کہ جب تک خود ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم تھی کسی بیرونی اسلامی حکومت سے مسلمانوں کو بلا واسطہ تعلق رکھنے کی کوئی ضرورت ہی پیش نہ آئی - البتہ سلطنت مغلیہ کے انقضائے

کے بعد مجبور ہو گئے کہ بلا واسطہ خلافت قسطنطنیہ سے اپنا رشتہ انقیاد و عقیدت قائم کریں۔ تاہم سلاطین عثمانیہ کا اسلام کی مرکزی خلافت پر قابض ہونا ایک ایسی مسلم و معروف بات ہے جو ہمیشہ علماء ہند کے علم و اعتقاد میں رہی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ کا سال وفات سنہ ۱۱۷۴ھ - ہجری ہے۔ اُنکا زمانہ احمد شاہ ابدالی کی آمد و رفت کا زمانہ تھا اور ہندوستان میں اسلامی حکومت ابھی قائم تھی۔ انہوں نے تفہیمات الہیہ میں درجہ سلاطین روم کا ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

”از زمان سلطان سلیم خاں کہ در اوائل سنہ الف ہجری، اکثر بلاد عرب و مصر و شام تحت تصرف سلاطین روم اند، و خدمت حرمین الشریفین زاد ہما اللہ شرفاً و کرامتہ، و امارت موسم، و ریاست حجاج، و اہتمام محافل و قوافل ہر ایشان استقرار یافت۔ و بہ ہمیں جہت ہر منابر عرب و شام خصوصاً حرمین شریفین ہر یکے از ایشان بہ لقب امیر المومنین مذکور است“

یمن میں اگرچہ آئمہ زیدیہ سلاطین عثمانیہ کے رقیب و حریف تھے، اور انہوں نے اندرون ملک میں کبھی اُنکی حکومت چمکنے نہ دی۔ با این ہمہ گیارہویں سے تیرہویں صدی تک کے علماء یمن کی مصنفات کا جن لوگوں نے مطالعہ کیا ہے، اُنسے پوشیدہ نہیں کہ اکثر نے سلاطین عثمانیہ کی مرکزی حیثیت تسلیم کی ہے جسکے معنی بجز خلافت اسلامیہ کے اور کچھ نہیں ہو سکتے۔ علامہ صالح مقبلی صاحب العلم الشامخ المتولد سنہ ۱۰۴۷ھ، علامہ فلائی صاحب ایفاظ الہم، شیخ عبد الخالق زبیدی صاحب صفرة الاخبار و غیرہم اپنی کتابوں میں جا بجا ترکی گورنروں کے جبر و ستم کی شکایتیں کرتے ہیں، مگر ساتھ ہی سلاطین عثمانیہ کا ذکر ایسے پیرایہ میں کرتے ہیں جس سے اُنکی اسلامی خلافت و امامت کا مسئلہ ہونا ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً سلطان کو مخاطب کر کے یہ کہنا کہ جو شخص آج روم زمین پر تمام مسلمانوں کا خلیفہ و امام کہلائے، اسکے گورنر اس طرح رعایا کے ساتھ سلوک کریں؟ یہ موقع مزید اطناپ و تفصیل کا نہیں۔ سلاطین عثمانیہ کی خلافت کا زمانہ ہزار صدی کے بعد شروع ہوتا ہے۔ پس اگر اسکا ذکر مل سکتا ہے تو پچھلی در تین صدیوں کی مصنفات میں۔ چونکہ ان عہدوں کی تصنیفات عام طور پر علماء ہند کے مطالعہ میں نہیں آئی ہیں، اسلیے مسئلہ کے تاریخی شواہد سے عموماً لوگ بے خبر ہیں۔ تلاش کیا جائے تو ایک بڑا ذخیرہ تاریخی شواہد کا فراہم ہو سکتا ہے۔

خود یورپین حکومتیں علی الخصوص برٹش گورنمنٹ سلطان عثمانی کی اس دینی حیثیت کا ہمیشہ اقرار کرتی آئی ہے اور جب کبھی ضرورت ہوئی ہے، قسطنطنیہ کی طاقت سے بہ حیثیت خلیفہ اسلام کام لیا گیا ہے۔ غدر سنہ ۵۷ء کے موقعہ پر سلطان عبد المعید سے جو فرمان مسلمانان ہند کے نام حاصل کیا گیا تھا اور جس میں انگریزی حکومت کے ساتھ بہتر سلوک کرنے کی ہدایت کی تھی، اُسکی بنا یہی تھی کہ سلطان قسطنطنیہ کو بہ حیثیت خلیفہ اسلام مسلمانان ہند کی (ارشاد و ہدایت کا حق حاصل ہے۔ کٹرین و کٹوریا کے عہد میں بارہا حج اور حاجیوں کی مشکلات کا سوال گورنمنٹ آف انڈیا کی طرف سے اٹھایا گیا، اور پھر امپریل گورنمنٹ نے باب عالی کو اس احتجاج کے ساتھ توجہ دلائی کہ بہ حیثیت خلیفہ اسلام ہونے کے حجاج کی تکالیف دور کرنا اُنکا مذہبی فرض ہے۔ فرانس اور روس کی جانب سے بھی سلطان عبد الحمید خان کے زمانے میں متعدد مرتبہ ایسے اظہارات و اعترافات ہو چکے ہیں۔

(قرآن متروسطہ و اخیرہ میں مرکزی حکمرانی)

ہم نے جا بجا ”اسلام کی مرکزی حکمرانی“ اور ”خلافت عظمیٰ“ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ تشریح اس اجمال کی یہ ہے کہ اسلام کے تمام احکام کا محور و اساس مسئلہ ”توحید“ ہے۔ ”توحید“ کے معنی یہ ہیں کہ ایک ہونا۔ صرف اللہ کی ذات و صفات ہی میں یہ حقیقت محدود نہیں ہے جیسا کہ بد قسمتی سے لوگوں نے سمجھ رکھا ہے۔ بلکہ عقائد و اعمال کی ہر شاخ اور ہر شکل میں اسلام کا اصل الاصل توحید ہی ہے۔ وہ مسلمانوں کی تمام اُن باتوں میں جو فرد و اجتماع سے تعلق رکھتی ہیں، ایک کامل توحیدی حالت پیدا کردیگی چاہتا ہے۔ خدا کی ذات کی طرح اُسکی خلقت اور قوانین خلقت میں بھی ہر چیز پر اور ہر جگہ یگانگی و یک عملی اور وحدت و واحدیت کا فرما ہے۔ ما تروی فی خلق الرحمن من تفاوت۔ فارج البصر، هل تروی من فطور؟ (ملک۔ قال ابن عباس ”تفاوت“ ای الاختلاف اخرجه البخاری) پس اس بنا پر اسلام نے جس طرح مسلمانوں کی ساری باتیں ایک قرار دی تھیں۔ اُنکی شریعت، اُنکا قانون، اُنکی کتاب، اُنکا نام، اُنکی زبان، اُنکی قومیت، اُنکا قبلہ، اُنکا کعبہ، اُنکا مرکز اجتماع، اُنکا مرکز ارض، اُسی طرح اُنکی حکومت بھی ایک ہی قرار دی تھی۔ یعنی تمام روئے زمین پر مسلمانوں کا صرف ایک ہی فرمانروا و خلیفہ ہو۔ لیکن جہاں ساری باتوں

میں انحراف اور تفرقہ و انتشار ہوا ، وہاں یہ بات بھی جاتی رہی - خلفاء راشدین کے بعد صرف بنو امیہ کے ابتدائی عہد تک یہ وحدۂ نظر آتی ہے - اُسکے بعد کوئی زمانہ ایسا نہ آیا جب تمام عالم اسلامی کی حکومت کسی ایک طاقت میں جمع رہی ہو - مختلف گوشوں میں مختلف دعویدار اُٹھیں ، اور جسکا قدم جہاں جم گیا ، خود مختارانہ فرمانروائی کرنے لگا - یہی وجہ ہے کہ مورخین نے بنو امیہ مروانیہ کے عہد کو تاریخ اسلام کا بہترین زمانہ قرار دیا ہے جب کرۂ ارضی کے تمام اسلامی خطے پر صرف ایک ہی خلیفہ کی حکومت قائم تھی - علی الخصوص عبد الملک بن مروان کا زمانہ کہ تمام مشرق و مغرب و افریقہ کے منبروں پر بجز ایک حکمران کے اور کسی کا ذکر نہ تھا - اسی لیے حافظ ذہبی نے کہا - بنو امیہ نے خلافت راشدہ کی برکتیں نہ پالیں لیکن بنو عباس کو بنو امیہ کی بھی برکت نہ ملیں - خلفاء عباسیہ کے زمانے میں تفریق کلمہ و حکومت کا معاملہ آخری حد تک پہنچ گیا - تمام اسلامی دنیا مختلف حکمرانوں میں بت گئی -

با ایں ہمہ ایک خاص مرکزی اقتدار ہر زمانے میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے اور مورخ کی بصیرت محسوس کر لیتی ہے کہ اس تفرقہ و انتشار کی عام سطح میں ایک مرکزی قوت ابھری ہوئی ہے - اسلامی حکومتیں ہر گوشہ عالم میں قائم ہو گئی تھیں ، مگر ہمیشہ ایک خاص مقام ایسا ضرور رہا ، جہاں کی حکمرانی دنیا کی تمام اسلامی حکمرانیوں میں ایک مرکزی اقتدار کی حیثیت رکھتی تھی - دوسرے مقامات کے فرمانروا اپنے دائرہ حکومت سے باہر کوئی اثر نہیں رکھتے تھے ، لیکن وہاں کا حکمران باہر کے مسلمانوں کیلئے بھی ایک خاص کشش و دعوت اپنے اندر رکھتا تھا - یہ بلاد شام و عراق اور عرب و حجاز کی حکومت تھی - عرب اسلام کا اصلي سرچشمہ و مبداء ہے - حجاز اسلامی قومیت کا دائمی مرکز اور اسلام کے رکن حج کا کار گاہ - شریعت نے عرب ہی کو یہ شرعی خصوصیت دی ہے کہ ہمیشہ غیر مسلم اقوام کے اثر سے محفوظ رکھا جائے - شریعت کے اس حکم کی تعمیل بغیر حکومت کے ممکن نہیں - جو حکومت اسپر قابض ہوگی ، رہی اس شرعی حکم کی تعمیل و نفاذ کی ذمہ دار ، اور اقامۂ حج کی بھی کفیل ہوگی - پس قدرتی طور پر یہ بات ہوئی کہ یہاں کی حکومت کو تمام اسلامی حکومتوں میں ایک مرکزی اقتدار اور

تمام مسلمانان عالم کے قلوب کیلئے ایک انجذابی اثر حاصل ہو جائے۔ اسلام کے از منہ متوسطہ و اخیرہ میں یہی مرکزی اقتدار خلافت عظمیٰ کا قائم مقام تھا۔ خلافت بغداد کے مرنے کے بعد بھی ان مقامات کی حکومت خلفاء مصر ہی کے قبضہ میں رہی۔ ”مرکزی حکومت“ سے مقصود یہی مرکزی اقتدار ہے۔ خلفاء مصر کے بعد جب سلاطین عثمانیہ تمام بلاد عرب و حجاز اور مصر و شام پر قابض ہو گئے تو بارجوں متعدد اسلامی حکومتوں کی موجودگی کے، اسلامی خلافت عظمیٰ کا مرکزی اقتدار بلا نزاع انہی کو حاصل ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہزار صدی کے بعد سے پندرہویں صدی کے اوائل تک اگرچہ بری بری اسلامی حکومتیں دنیا میں قائم رہیں، لیکن خلافت عظمیٰ کے اعتقاد کے ساتھ جب کبھی کسی مسلمان کی نظر اٹھتی تو وہ صرف قسطنطنیہ ہی کی طرف دیکھ سکتا تھا۔

(ترکان عثمانیہ اور عالم اسلامی)

اب ہم چاہتے ہیں کہ اس پوری تاریخ سے قطع نظر کر لیں۔ صرف اس اعتبار سے مسئلہ پر ایک آخری نظر ڈالیں کہ احکام شرعیہ کی بنا پر سلاطین عثمانیہ کے اعمال خلافت کا کیا حال رہا ہے ؟ بحث کا یہ سب سے زیادہ قطعی اور سب سے زیادہ سہل فیصلہ ہوگا۔ اسلام نے خلیفہ کے نصب و تقرر کے خاص مقاصد قرار دیے ہیں۔ پچھلی پانچ صدیوں کے اندر متعدد اسلامی حکومتیں دنیا میں موجود تھیں اور بعض اب تک موجود ہیں۔ قوم و جماعت کے اعتبار سے متعدد مسلمان قوموں میں حکومت رہی اور بعض حکمران قومیں اب بھی باقی ہیں۔ گو انکی حکومت محض برائے نام ہو۔ سوال یہ ہے کہ ان تمام حکمران قوموں میں کونسی حکومت اور قوم ایسی ہے جس نے شریعت کے تہرے ہوئے مقاصد خلافت انجام دیے ؟ اور جو غرض شرعی خلیفہ کے قیام اور بحکم الذین ان مکناہم فی الارض الخ تمکین فی الارض سے ہے، وہ انکے ہاتھوں پوری ہوئی ؟ جس حکومت اور جس حکمران قوم نے ایسا کیا ہو، صرف وہی حکومت اور قوم تمام مسلمانان عالم کی خلافت و امامت کا دعوا کر سکتی ہے۔

اس اہم سوال کا فیصلہ چند سطور میں ہو جاسکتا ہے۔ ”خلافت اسلامیہ“ کا مقصد شرعی پچھلی صدیوں میں صاف ہو چکا ہے۔ سب سے پہلا مقصد اس کا یہ ہے کہ ایک ایسی طاقتور حکومت قائم ہو جو دشمنوں

عے حملوں سے اسلامی ممالک اور مسلمانوں کی حفاظت کرسکے - اسلام و ملت کے دشمنوں کا استیصال و انسداد ہو - کلمہ حق دنیا میں بلند اور دور دور تک جاری و نافذ ہو جائے - کلمہ کفر و فساد کو خسران و ناکامی نصیب ہو - یہی مقصد پہلا مقصد ہے - باقی سب فروع و توابع ہیں - یہی وجہ ہے کہ تمام کتب عقائد و اصول میں خلافت کی تعریف کرتے ہوئے ”اقامة الدین باقامة اركان الاسلام“ والقیام بالجهاد“ و حفظ حدود الاسلام“ و ما يتعلق به من ترتيب الجیش والغرض للمقاتلة“ کے جملے سب سے پہلے ملتے ہیں - یعنی وہ مسلمانوں کی ایسی حکومت ہے جو اركان اسلام کو قائم رکھے، جہاد کا سلسلہ و نظام درست کرے، اسلامی ملکوں کو دشمنوں کے حملوں سے بچائے، اور ان کاموں کیلئے فوجی قوت کی ترتیب اور لڑائی کا سامان وغیرہ جو کچھ مطلوب ہو اسکا انتظام کرے - مختصر یہ کہ اسلام کا خلیفہ وہ حکمران ہوسکتا ہے جو اسلام و ملت کیلئے دفاع و جہاد کی خدمت انجام دیسکے - ساری باتیں ان در لفظوں میں آگئیں -

اب فیصلہ کرلو کہ گذشتہ چار صدیوں کے اندر کس حکومت اور کس قوم نے دفاع و جہاد کی خدمت انجام دی ہے؟ اسلام کا جب ظہور ہوا، تو دشمنوں کی پہلی جماعت قریش مکہ کی جماعت تھی - انکے مت جانے کے بعد اس پوری تیرہ صدیوں میں صرف عیسائی قومیں ہی مسلمانوں کی دائمی حریف رہی ہیں - دوسری غیر مسلم قوموں میں سے کوئی قوم ایسی نہ تھی جس میں اسلام اور مسلمانوں پر حملہ آرہوئے کا داعیہ ہو - ایران کی مجوسی قوت کا ابتدا ہی میں خاتمہ ہو گیا - یہودیوں کی کوئی پولیٹکل قوت نہ تھی - ہندوستان کے ہندو اور بدھ مذہب کے پیروں نے ہندوستان سے نکل کر کبھی مسلمانوں پر حملہ نہیں کیا اور نہ انہیں کوئی داعیانہ قوت تھی - چین کے تاریخی آثار بلاشبہ سب سے بڑی ہلاکت کا باعث ہوئے لیکن بالآخر خرد اسلام کے محکوم ہو گئے - یعنی ایک صدی کے اندر ہی اندر مسلمان ہو گئے -

پس تمام روئے زمین پر بجز مسیحی اقوام کے آر کر کوئی حملہ آور حریف اسلام کا نہ تھا - نہ ہے - مشرقی عیسائیوں کی قوت ابتدا ہی میں شکست ہو گئی تھی - صرف یورپ کی حکومتیں اور قومیں تھیں جنکو خواہ مسیحیت کے نام سے مرسوم کرر خواہ یورپ کے نام سے - یہی آخری چار صدیاں ہیں جن میں بتدریج یورپ کی طاقت ترقی کرتی گئی، اور

اُسکی ترقی کا دوسرا رخ یہ تھا کہ اسلام کی پولیٹیکل طاقت کو روز افزوں
تنبول ہوا - اب فیصلہ کرلو کہ تمام کرۂ ارضی کے مسلمانوں میں سے کونسی قوم
اور کونسی حکومت ہے جس نے ان چار صدیوں کے اندر یورپ کا مقابلہ
کیا ہے ، اور دفاع و جہاد جاری رکھ کر اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت کی
ہے ؟ سولہویں صدی عیسوی ہی میں یورپ کی اُن تمام طاقتوں نے جو
مشرقی ممالک کے دروازوں سے قریب تھیں ، بتدریج قدم بڑھانا شروع
کردیا تھا - اگر کوئی طاقتور اور مقام رک مروجہ نہ ہوتی تو اسے دو صدی
پیشتر ہی تمام وسط ایشیا ، شام ، عرب ، اور اسلامی افریقہ یورپ کے استیلاء
سے پامال ہوچکا ہوتا -

پھر وہ کونسی ناقابل تسخیر فوجی قوت تھی جس نے پہلے تو اپنے
پے درپے حملوں سے تمام یورپ کو اس طرح پامال کردیا کہ پوری دو صدیوں
تک سنبھلنے اور قدم اٹھانے کی مہلت ہی نہ ملی ، اور پھر تمام ایشیا و
بلاد اسلامی کے عین دروازہ پر مغربی مدافعت کی ایک آہنی دیوار قائم
کردی ، اور اس طرح حکم جہاد کے فرض ہجوم اور فرض دفاع ، دونوں کو تنہا
انجام دیا ؟

کیا ہندوستان کی سلطنت مغلیہ نے جس نے اپنی پوری تاریخ میں
ایک بار بھی ہندوستان سے باہر قدم نہ نکالا ؟ اور جسکی تلوار پانچ صدیوں کے
اندر ایک مرتبہ بھی کسی حریف ملت کے خوں سے رنگین نہ ہوئی ؟
عین اکبر اعظم کے زمانے میں ہندوستان کے حاجیوں کو پرتگالیوں اور
دچروں کے جرگے ساحل ہند کے سامنے لوت رہے تھے اور وہ انکے انسداد سے
عاجز تھا !

کیا ایران کے سلاطین نے ، جنکے عقبی حملوں نے ہمیشہ سلاطین عثمانیہ کو
مجبور کیا کہ یورپ کا فتح مندانہ اقدام ترک کر کے ایشیاء کی طرف متوجہ
ہوجائیں اور جسکی وجہ سے یکایک یورپ کو ترکی تلواروں سے مہلت ملگئی
اور تمام وسط یورپ فتح ہوئے رہ گیا ؟

کیا یمن کے خوں مختار قبائل اور عرب اُئمہ نے ، جنکو اسلام کے اس
سب سے بڑے حریف کا شاید حال بھی معلوم نہ تھا ؟

ہر انسان جو در اور در کو صرف چار ہی کہنا چاہتا ہے ، اسکا اقرار کریگا
کہ بجز سلاطین عثمانیہ اور ترکوں کے مسلمانوں کی کوئی حکومت اور قوم
نہیں ہے جس نے قرن اخیرہ میں حفظ اسلام و ملت کی یہ خدمت انجام

دی ہو۔ اور جو فرض تمام مسلمانان عالم کے ذمے عائد ہوتا تھا ' اُسکو سب کی طرف سے تنہا پورا کرتے رہے ہوں ؟

حقیقت یہ ہے کہ ترکوں کا یہ وہ عظیم الشان کارنامہ ہے جسکی نظائر قرون اراں کے بعد مسلمانوں کی کسی حکمران قوم کی تاریخ پیش نہیں کرسکتی۔ صرف صلاح الدین ایوبی کی دعوت اس سے مستثنیٰ ہے جس نے تمام یورپ کے متحدہ مسیحی جہاد کو شکست دی۔ تاہم وہ بھی ایک محدود زمانے کا جہاد تھا۔ مسلسل تین چار صدیوں تک صرف ترکوں ہی کی اسلامی مدافعت قائم رہی ہے۔ ان پوری چار صدیوں میں تمام رے زمین کے مسلمان اس اولین قومی فرض سے غافل رہے۔ کسی قوم نے ایک زخم بھی اس مقدس راہ میں نہیں کھایا۔ کسی پادشاہ نے ایک قدم بھی اسکے لیے نہیں اٹھایا۔ صرف تنہا ترک ہی دنیا بھر کے مسلمانوں کی جانب سے یہ پورا کام انجام دیتے رہے۔ انہوں نے تمام مسلمانان عالم کو عیش و راحت کے بستروں پر چھوڑ دیا۔ خود اپنے لیے خاک و خون کی دائمی زندگی پسند کی۔ اگر ان قرون اخیرہ میں کہ مسلمانوں کا تزل و ادبار آخری درجہ تک پہنچ چکا تھا، اور علی الخصوص فرض دفاع و جہاد کو کہ سنام دین، رعماد ملت، و اساس شرع ہے، تمام رے زمین کے مسلمان چھوڑ بیٹھے تھے، ترکوں کی جانفروشی و سر باز جماعت تنہا نہ سنبھال لیتی، تو نہیں معلوم آج جغرافیۂ عالم میں مسلمانوں کی آبادیوں کا کیا حال ہوتا؟ اور جو مصیبت اسوقت درپیش ہے، وہ کب کی آپکی اور مسلمانوں پر سے گزر چکی ہوتی؟ تمام دنیا کے مسلمانوں پر ترکوں کا یہ وہ احسان عظیم ہے کہ اگر اسکے معارضہ میں مسلمانان عالم اپنا سب کچھ اُن پر سے قربان کر دیں، جب بھی اُنکے بار احسان سے سبکدوش نہیں ہوسکتے۔ اگر گذشتہ صدیوں میں مسلمانوں نے پادشاہتیں کی ہیں تو صرف انہی کی بدولت، اور اگر آج اپنی پادشاہتیں کھو کر بھی کچھ نہ کچھ عزت کی پرنجی اپنے ساتھ رکھتے ہیں تو صرف انہی کی بدولت۔ مسلمان خوار دنیا کے کسی حصہ میں بستا ہو، چین میں یا افریقہ کے بعید گوشوں میں، لیکن صدیوں سے اُسکی قومی زندگی، قومی عزت، قومی عیش و آرام، اور وہ سب کچھ جو ایک قوم کیلئے ہے اور ہرسکتا ہے، صرف ترکوں ہی کے طفیل ہے اور انہی کا بخشا ہوا۔ یہی

وجہ ہے کہ تمام دنیا کے مسلمانوں کا فرض ہوا کہ ترکوں کی مدد کریں - لیکن ترکوں کیلئے یہ کچھ ضروری نہیں کہ وہ ہندوستان یا افریقہ میں بانٹنے کیلئے روپیہ بھیجتے رہیں - وہ تو چار صدیوں سے وہ کام انجام دے رہے ہیں جسکے تصور سے بھی ہم مسلمانان ہند کے دل کانپتے اور جسکے رھم سے ہی ہم پر مروت طاری ہو جاتی ہے ؟ یعنی اپنی جانیں اسلام کی حفاظت کی راہ میں قربان کر رہے ہیں - اس سے بڑھکر اور کونسا کام ہے جو اسلام اور مسلمانوں کیلئے کیا جا سکتا ہے ؟ اس کے بعد کیا رہ گیا جسکی طلب اور سوال ہو ؟ بہت ممکن ہے کہ کسی دوسرے حصے کے مسلمانوں نے ترکوں سے زیادہ نمازیں پڑھی ہوں ، لیکن نماز کے بقا کی راہ میں آنسے زیادہ اپنا خون کسی نے نہیں بہایا - بہت ممکن ہے کہ عرب اور ہندوستان کے مسلمانوں کی زبانوں نے ان سے زیادہ قرآن کی تلاوت کی ہو ، لیکن قرآن کی حفاظت کی راہ میں چار سو برس سے زخم صرف اُنہی کے سینے کھا رہے ہیں - اگر اللہ کی شریعت حق ہے اور اگر قرآن و سنت کا فیصلہ باطل نہیں ، تو ہمیں یقین کرنا چاہیے کہ دوسرے ملکوں کے ہزاروں عابد و زاہد مسلمانوں سے جنکے دلوں میں کبھی جہاد فی سبیل اللہ کا خطرہ بھی نہیں گذرتا ، ترکوں کا ایک گناہگار و معصیت آلود فرد اللہ کے آگے کہیں زیادہ فضیلت و محبوبیت رکھتا ہے - ہمارے مدد العمر کی عبادتیں بھی اُنکے سینے کے ایک خونچکاں زخم اور اس سے بہنے والے ایک قطرہ خون کی عظمت نہیں پاسکتیں - ” حرس لیلۃ فی سبیل اللہ افضل من الف لیلۃ یقام لیلھا و یصام نہارھا “ (۱) یعنی آنحضرتؐ نے فرمایا : جہاد فی سبیل اللہ کی ایک رات ہزار دنوں کے روزوں اور ہزار راتوں کی عبادت سے بھی افضل ہے ! ان اللہ یحب الذین یقاتلون فی سبیلہ صفا کانہم نبیان مرموص - حضرت عبد اللہ بن مبارک نے حضرت فضیل بن عیاض کو ایک مرتبہ یہ اشعار لکھکر بھیجے تھے :

یا عابد العزمین لو ابصرتنا * لعلمت انک فی العبادۃ تلعب !
من کان یتخضب خدہ بدمرغہ * فنحورنا بدمائنا تتخضب !
ریح العبیر لکم ، ونحن عبیرنا * ریح السناک والغبار الاطیب (۲)

(۱) اخبرہ الامام احمد عن مصعب بن زید -

(۲) حافظ ابن عساکر نے امام مرموص کے ترجمہ میں یہ اشعار نقل

کیے ہیں - امام مرموص ایک سال درس حدیث دیتے ، ایک سال

جو مسلمان یورپ کے مسیحی سیاسی اثر سے مختل ہو کر ترکوں پر اعتراض کرتے ہیں، انکو چاہیے کہ پہلے اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں کہ صدیوں سے آنکی منافقانہ غفلت و اعراض کا کیا حال رہا ہے؟ علی الخصوص ہندوستان کے مسلمانوں کو جو تعداد میں ہر جگہ کے مسلمانوں سے زیادہ ہیں، غور کرنا چاہیے کہ جس اولین فرض دینی کیلئے ترک چار سو برس سے اپنا خون بہا رہے ہیں، انہوں نے اس کے لیے کیا کیا؟ زیادہ سے زیادہ یہ کہ کبھی کبھار چند لاکھ سکے ترک زخمیوں کی مرہم پٹی کیلئے بیعیدے جو ایک ترک بیوہ کی مصیبت اور ایک ترک یتیم کے آنسوؤں کی قیمت بھی نہیں ہوسکتے؟ کیا ایسے لوگوں کو جو رات بستروں پر اور دن آرام و بے فکری کی چھتوں کے نیچے بسر کرتے ہوں، یہ حق پہنچتا ہے کہ ان لوگوں پر زبان طعن کھولیں

جو چار سو برس سے اپنی لاشیں خاک و خون میں تڑپا رہے ہیں؟

بہر حال منصب خلافت کا پہلا مقصد دفاع و جہاد ہے۔ وہ پچھلی چار صدیوں میں بجز ترکوں کے اور کسی اسلامی حکومت نے انجام نہیں دیا۔ پس اگر آرد دلائل و شواہد نہ ہوتے، جب بھی صرف یہی ایک بات سلاطین عثمانیہ کی خلافت و امامت کیلئے کفایت کرتی تھی۔

اور پھر یہ بھی واضح رہے کہ یہ تمام مباحث اس سوال سے تعلق رکھتا تھا کہ گذشتہ صدیوں میں متعدد اسلامی حکومتوں کے رہتے ہوئے سلاطین عثمانیہ ہی کیوں خلافت عظمیٰ کے حقدار تسلیم کیے گئے؟ لیکن موجودہ زمانے میں جبکہ تمام اسلامی حکومتیں مت چکی ہیں، مسلمانان عالم کیلئے بجز سلطان عثمانی کے کسی دوسری خلافت کا وجود ہی نہیں۔

[بقیہ نوٹ صفحہ ۹۰]

تجارت کرتے، ایک سال جہاد میں شرکت فرماتے۔ حضرت فضیل اُس عہد کے مشہور عباد زہاد میں سے ہیں۔ حاصل ان اشعار کا یہ ہے ”اے حرمیں کے گوشہ نشین عابد! اگر تو نے ہمارا حال دیکھا ہوتا تو معلوم کر لیتا کہ جس زہد و عبادت میں مشغول رہتا ہے وہ تو ایک طرح کا کھیل ہے۔ جو شخص اپنے رخسار آنسوؤں سے (عبادت میں) تر کرتا ہے، اُسے معلوم ہونا چاہیے کہ ہماری عبادت وہ ہے جس میں رخسار آنسوؤں سے نہیں بلکہ گردنیں خون سے رنگین ہوا کرتی ہیں“! حضرت فضیل نے جب یہ اشعار پڑھے تو آنکی آنکھیں اشکبار ہو گئیں اور فرمایا ”صدق ابو عبد الرحمن“ عبد اللہ بن مبارک نے سچ کہا!

(فَرِيضَةُ عَظِيمَةُ دِفَاع)

نتائج بحث تک پہنچنے میں اب صرف ایک منزل اور باقی رہ گئی ہے -
 آمید ہے کہ آپ صبر و سکون کے ساتھ میرا ساتھ دینگے - اسلام کے شرعی
 واجبات و فرائض میں ایک نہایت اہم اور اکثر حالتوں میں
 ایمان و کفر تک کا فیصلہ کر دینے والا فرض ”دفاع“ ہے - تشریح اسکی
 یہ ہے کہ جب کبھی کسی مسلمان حکومت یا کسی مسلمان آبادی پر کوئی
 غیر مسلم گروہ یا حکومت حملہ کرے ، تو یکے بعد دیگرے تمام دنیا کے
 مسلمانوں پر شرعاً فرض ہو جاتا ہے کہ دفاع (Defence)
 کیلئے اُٹھ کھڑے ہوں ، اس حکومت اور آبادی کو غیر مسلم قبضہ سے لڑ کر
 بچائیں - اگر فوری قبضہ ہو گیا ہے تو اس سے نجات دلائیں ، اور اس کام
 کیلئے اپنی ساری قوتیں اور ہر طرح کی ممکن کوششیں وقف کر دیں -
 اس بارے میں قرآن و حدیث کے احکام اس کثرت سے موجود ہیں ، اور
 اسلامی فرائض میں سے یہ اسدرجہ مشہور فرض ہے کہ شاید ہی دنیا میں
 کوئی مسلمان اس سے نا واقف نہ لگے - یہی باہمی مددگاری و یارپی اور دفاع
 اعداء کا قانون ہے جس پر اسلام نے شریعت و امت کی حفاظت کی ساری
 بنیادیں استوار کی ہیں - لڑائی لڑنے کی نسبت سب سے پہلی آیت جو
 نازل ہوئی ، یہ سورہ حج میں ہے :

ان الله يدافع عن الذين	اللہ تعالیٰ مومنوں پر سے انکے دشمنوں کو ہٹاتا
آمذوا ، ان الله لا يحب كل	رہتا ہے - وہ ان لوگوں کا ساتھی نہیں جو اُسکی
خوار كفور - اذن للذين	بخشی ہوئی طاقت کے امانت دار نہیں ہیں ،
يقاتلون بانهم ظلموا ، و ان	اور شکرگزاری کی جگہ کفران نعمت میں سرشار
الله على نصرهم لقدير	ہیں - جن مسلمانوں سے کافر لڑ رہے ہیں ،
الذين اخرجوا من ديارهم	اب ان مسلمانوں کو بھی کافروں سے لڑنے کی
بغير حق الا ان يقولوا ربنا	اجازت دی جاتی ہے کیونکہ اُنپر ظلم ہو رہا ہے ،
الله - (۲۲ : ۴۲)	اور اللہ مظلوموں کی مدد کرنے پر قادر ہے -
یہ وہ لوگ ہیں کہ بلا کسی حق کے اپنی آبادیوں سے نکال دیے گئے - انکا کوئی	
قصور نہ تھا - صرف یہ کہ اپنے پروردگار کے ماننے والے ہیں - (۱)	

(۱) رومی الحاکم من حدیث الاعمش عن ابن عباس : قال : لما خرج
 رسول الله صلعم من مكة قال ابو بكر ” اخرجوا نبیہم - انا لله وانا اليه راجعون -

بعض مفسرین نے سورہ بقرہ کی حسب ذیل آیت کو اذن قتال کا پہلا حکم قرار دیا ہے :

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ
الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا
إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ -
وَأَقْتُلُواهُمْ حَيْثُ تَقْبَلُوهُمْ
وَأُخْرَجُوا مِنْ حَيْثُ
أُخْرِجُوا - وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ
الْقَتْلِ - (۲ : ۱۸۷)
اللہ کی راہ میں اُن لوگوں سے لڑو جو
مسلمانوں سے لڑائی لڑ رہے ہیں - مگر
زیادتی نہ کرو۔ اللہ حد سے گزر جانے والوں کو
پسند نہیں کرتا - اور ایسا کر کہ جہاں کہیں
بھی رہے جیسے ہرے ملیں ، قتل کرو۔ اور
جہاں کہیں سے انہوں نے مسلمانوں کو
نکالا ہے ، تم بھی نکال باہر کرو۔ ایسا کرنا اگرچہ
خونریزی ہے ، مگر خونریزی کی برائی سے بھی بڑھ کر برائی ظلم و فساد کا
فتنہ ہے -

امام ابن جریر نے ابر العالیہ کا قول نقل کیا ہے کہ جنگ کی نسبت
یہی پہلی آیت ہے جو نازل ہوئی ” اُنْهَا اَوَّلُ آيَةٍ نَزَلَتْ فِي الْقِتَالِ بِالْمَدِينَةِ
فَلَمَّا نَزَلَتْ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّيَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُقَاتِلُ مَنْ قَاتَلَهُ وَيَكْفِ عَمَّنْ كَفَّ عَنْهُ “
حتیٰ نزلت سورة براءة“ پس اذن قتال کی پہلی آیت یا سورہ حج کی ہے
یا بقرہ کی -

ان دونوں آیتوں اور انکے ہم مطلب آیات میں قرآن حکیم نے حکم قتال کے
اُس حصہ کو صاف صاف مسلمانوں پر فرض کر دیا ہے جسکا مقصد دفاع
(دِیْفَنْس) ہے (۱) - یعنی جب کبھی غیر مسلموں کی کوئی جماعت
مسلمانوں کی کسی حکومت اور آبادی پر حملہ کرے ، یا اُس پر
خود قابض ہر جانا چاہے ، تو مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنے بھائیوں کی
مدد کیلئے اُٹھ کھڑے ہوں - جس طرح حملہ آوروں نے حملہ کیا ہے ، یہ

[بقیہ نوٹ صفحہ ۹۲]

لیہلکن “ فانزل الله اذن للذين يقاتلون الخ و هي اول آية نزلت في القتال -
اسنادہ علی شرط الصحیحین -

(۱) یعنی حکم جہاد کی مختلف قسموں اور صورتوں میں سے ایک
قسم قتال ہے - پھر قتال کی بھی دو قسمیں ہیں - دفاع اور ہجوم - ان
آیات میں دفاع کا حکم ہے - ہجوم کا حکم دوسری آیتوں میں ہے - اور
اسکے مواقع و برامت اور شرائط دوسرے ہیں -

بھی کریں - قتل و جنگ کی رہ جو چال چلے ہیں ، یہ بھی چلیں -
البتہ یہ جائز نہیں کہ اس بارے میں رحم و عدل کے جو حدود شریعت نے
باندھ دیے ہیں (مثلاً ضعیفوں ، بزرگروں ، نہتوں ، عورتوں ، راہبوں ، مذہبی
عباد نگاہوں وغیرہ سے تعرض نہ کرنا) اُنسے قدم باہر نکالیں - پھر اس حکم کی
عمل بھی بتلا دی کہ الْفَتْنَةُ إِشْدَ مِنْ الْقَتْلِ - بلا شبہ یہ جنگ قتل سے ار
انسانی قتل بہت بڑی برائی ہے ، لیکن اس برائی سے بھی بڑھ کر برائی یہ
ہے کہ لوگ اپنی آبادیوں اور حکومت پر قانع نہیں رہتے - دوسروں کے حقوق
آزادی و حکومت چھیننا چاہتے ہیں - توحید کی جگہ کفر و شرک کے ماتحت
مسلمانوں کو لانا چاہتے ہیں ، قوموں کا قدرتی حق حریت پامال کر رہے
ہیں - اگر اسکے دفع کا انتظام نہ کیا جائے ، تو پھر دنیا میں کوئی قوم زندہ
و باقی نہیں رہ سکتی - پس بڑی برائی کے دور کرنے کیلئے چھوٹی برائی
اختیار کر لینی چاہیے - یہ خود نیچر کا عالمگیر قانون اور کارخانہ حیات کا
دائمی عمل ہے - اگر ایسا نہ ہوتا تو خدا کبھی جنگ کا حکم نہ دیتا -

سورہ محمد (ص) میں قرآن نے حکم قتال اور جواز جنگ کی اصلی
عمل بھی بتلا دی ہے :

حَتَّى تَضَعَ الْحَرْبَ لَدُنْكَ رَهِيمًا ۖ لَّئِيْكَ يَرْجِعُ مَوْفُوقٌ
اور اڑھا - (۴۷ : ۶) ہو جائے -

یعنی اسلام کا اصلی مقصد یہ ہے کہ دنیا میں عالمگیر صلح و امن قائم
ہو جائے - ساری دنیا ایک قوم ، اور تمام نوع انسانی ایک گھرانے کی طرح
زندگی بسر کریں - لیکن جب تک جنگ کرنے والی ظالم و حریص قوتیں
باقی ہیں ، یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا - پس پہلے مفسد و جابر قوتوں کا
مقابلہ کرنا اور اُنکو فنا کر دینا ضروری ہوا - مضبوط اور مستقل امن اُسی
وقت قائم ہوگا ، جب پہلے امن کی خاطر اچھی طرح جنگ کر لی جائے :
حَتَّىٰ اِذَا اخَذْتُمُوْهُمْ ۖ يَٰۤاَنۡتٰكُمۡ لَدُوۡرُ ۚ كَیۡ لَا يَخۡذِلُوۡكُمۡ ۚ اِنۡ كُنۡتُمۡ رَّاۤیِیۡنَ
ہر جائیں - (۴۷ : ۵)

قاتلوں کا جب تک خون نہ بہایا جائیگا ، مقتولوں کا خون بہنا بند
نہ ہوگا :

و لَكُمْ فِی الْقِصَاصِ حَیۡۃٌ ۚ وَ لَکُمۡ فِی الْقِصَاصِ حَیۡۃٌ ۚ وَ لَکُمۡ فِی الْقِصَاصِ حَیۡۃٌ ۚ وَ لَکُمۡ فِی الْقِصَاصِ حَیۡۃٌ ۚ
اور اسی (الالباب - (۲ : ۱۷۹) امن کی زندگی پوشیدہ ہے !

لہذا حکم دیا کہ جب تک دنیا جنگ اور براہمت جنگ سے باز نہ آجائے، جنگ کرتے رہو۔ کبھی اس سے نہ تھکو۔ یہاں تک کہ دنیا میں جنگ کا نام و نشان ہی باقی نہ رہے ”تضع الحرب ارزارها“ جنگ اپنے ہتھیار ڈال دے۔ یعنی جنگ بالکل موقوف ہو جائے۔ فساد و بطلان کی وہ قوتیں ہی باقی نہ رہیں جو خدا کی زمین کو ہمیشہ انسانی خون سے رنگتی رہتی ہیں۔ قرآن کا دعوا ہے کہ عالمگیر امن کا یہ وقت دنیا پر ضرور آگیا۔ مگر اسی وقت آگیا جب تمام دنیا اسلام کی دعوت امن و اخوت کے آگے جھک جائیگی: هو الذي ارسل رسوله بالهدى ودين الحق، ليظهره على الدين كله و لوكرة المشركون (۹: ۶۱)

اسلامی احکام میں یہ حکم ”دفاع“ جو اہمیت رکھتا ہے، وہ عقائد ضروریہ کے بعد کسی حکم، کسی فرض، کسی رکن، کسی عبادت کو حاصل نہیں۔ قرآن و حدیث میں بار بار یہ بات بتلائی گئی ہے کہ قومی زندگی اسی عمل کے بقاء پر موقوف ہے۔ جب تک مسلمانوں میں یہ جذبہ باقی رہیگا اور اس کام کی راہ میں ہر فرد اپنی زندگی اور اپنا مال قربان کر دینے کیلئے طیار رہیگا، اسوقت تک دنیا کی کوئی قوم انہیں غالب نہ آسکیگی۔ جس دن یہ جذبہ مردہ ہو جایگا، اسی دن سے مسلمانوں کی قومی موت شروع ہو جائیگی۔ چنانچہ قرآن نے مڈال میں یہودیوں کی تاریخ پیش کی ہے۔ جب تک یہودیوں میں اعتقاداً و عملاً یہ جذبہ باقی رہا، حکومت و عزت انہیں کیلئے تھی۔ جب چند گھڑیوں کے عیش و راحت کا عشق قومی زندگی و عزت کے دائمی عیش کی طلب پر غالب آگیا، اور اس چیز کو چھوڑ بیٹھے، ذلت و محکومی کا داغ ہر یہودی کی پیشانی پر لگ گیا، اور ہمیشہ کیلئے خوار و ذلیل ہو کر رہ گئے: ضربت عليهم الذلة والمسكنه و باؤا بغضب من الله !

الم تر الى الملاء من بني اسرائيل من بعد موسى ؟
ان قالوا لذبي لهم ”ابعث لنا ملكا نقاتل في سبيل الله“ قال ”هل عسيتم ان كتب عليكم القتال الا تقاتلوا“ قالوا ”وما لنا

کیا بنی اسرائیل کا حال نہیں دیکھتے کہ موسیٰ کے بعد کیا ہوا ؟ پہلے تو خود ہی اپنے عہد کے نبی سے درخواست کی ”کسی کو ہم پر پادشاہ بنادو کہ اُسکے ماتحت اللہ کی راہ میں لڑیں“ انہوں نے کہا ”اگرچہ تم ایسا کہتے ہو لیکن امید نہیں کہ وقت پر پورے آؤ۔ اگر تم کو لڑائی کا حکم دیا گیا تو

الا تقاتل في سبيل الله
وقد اخرجنا من ديارنا
وابنائنا ؟ ” فلما كتب عليهم
القتال، تولوا الا قليلاً منهم
والله عليهم بالظالمين -
(۲ : ۱۲۲)

بزدلی دکھلا کے نافرمانی کر جاؤ گے “
ان لوگوں نے جواب دیا ” نہیں ایسا نہیں
ہو سکتا - ہم کو کیا ہو گیا ہے کہ حق کی
راہ میں ظالموں سے جنگ نہ کریں ؟ حالانکہ
انہوں نے ہم کو اور ہماری اولاد کو ہمارے
شہروں سے نکال دیا ہے “ لیکن دیکھو، جب

لڑائی کا حکم دیا گیا تو بجز چند حق پرستوں کے سب اپنے قول و قرار سے
پھر گئے - وقت پر انکا دعوا سچا ثابت نہ ہوا -

سنن ابو داؤد میں ہے ” اذا ضن الناس بالدينار والدرهم و تبايعوا بالعین
وانبعوا اذنا بقر “ و ترکوا الجہاد في سبيل الله ‘ انزل الله بهم بلاء ‘ فلم
يرفعه حتى يرجعوا “ یعنی جب کوئی جماعت جہاد في سبيل الله ترک
کردیتی ہے تو اس پر بلائیں نازل ہوتی ہیں جو کبھی درر نہیں ہو سکتیں -
الا یہ کہ وہ اس معصیت سے باز آئیں -

چونکہ شریعت و ملت کے قیام کی اصلی بنیاد یہی چیز تھی ‘ اسلیے
ہر حیثیت اور ہر اعتبار سے اس پر زور دیا گیا ‘ اور سارے عملوں اور
نیکیوں سے جو ایک مسلمان دنیا میں کرسکتا ہے ‘ اس عمل کا مرتبہ و اجر
افضل و اعلیٰ قرار دیا - جس عمل میں جس قدر زیادہ ایثار و قربانی ہوگی ‘
آتنا ہی زیادہ اسکا اجر و ثواب بھی ہوگا - ظاہر ہے کہ اس عمل سے بڑھکر
آر کس عمل میں مال و جان کا ایثار ہو سکتا ہے ؟

کوئی خاص وقت اور عہد اسکے لیے مخصوص نہیں - ہر حال اور ہر
زمانے میں ایک مسلم و مومن زندگی کے ایمان و صداقت کی بنیاد یہی چیز
اور اسی کا سچا عشق و رولہ ہے - یہی سنام دین ہے - یہی عبادت ملت ہے -
یہی اساس شرع ہے - یہی ملاک اسلام ہے - یہی ایمان و نفاق کی اصلی کسوٹی
ہے - یہی مومن کو منافق سے الگ کردینے کیلئے اصلی پہچان ہے - نماز
اسی سے ہے - روزہ اسی سے ہے - حج اسی سے ہے - زکوٰۃ کا سب سے پہلا
اور افضل مصرف یہی ہے - سب اسکے لیے ملوث ہو جاسکتے ہیں -
اسکو کسی کی خاطر نہیں چھوڑا جاسکتا - نماز دین کا ستون ہے اور روزہ
برائوں سے بچنے کی قہال ‘ لیکن یہ دین کی بنیاد ہے اور برائیوں کو
معدوم کردینے والی تلوار - پس اسکی فضیلت کو نہ نماز پہنچ سکتی ہے نہ
روزہ - نہ اس سے بڑھکر کوئی دوسرا عمل ہے جو اللہ کی نظروں میں

محبوب ہو اور کرنے والے کو اسکی دائمی محبوبیت سے سرفراز کر دے - ہزاروں نمازیں اور ہزاروں روزے بھی اُس ایک قطرہ خون کی فضیلت و تقدیس نہیں پاسکتے جو اس راہ میں بہایا گیا ، اور عمر بھر کی صدقات و خیرات بھی اُس ایک درہم کے اجر کا مقابلہ نہیں کرسکتیں جو اس راہ میں خرچ کیا گیا - حتیٰ کہ یہی عمل اسلام و ایمان کی اصلی پہچان قرار پایا - جس مسلمان کا دل اسکے رولہ و طلب سے خالی ہوا ، وہ ایمان و اسلام کی روشنی سے محروم ہوگیا - نفاق کی ظلمت اُسپر چھا گئی - صحیح مسلم میں ہے :

من مات ولم يغز ولم يحدث نفسه به ، مات عليٰ شعبة من النفاق
جو مسلمان اس حالت میں دنیا سے گیا کہ نہ تو کبھی اللہ کی راہ میں لڑائی لڑی ، اور نہ اُسکے دل میں اس بات کی طلب رہی ، تو اُسکی موت ایسی حالت میں ہوئی جو نفاق کی شاخوں میں سے ایک شاخ ہے -

قرطبی نے اسکی شرح میں کہا ” فیہ دلیل علی رجب العزم “ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ جہاد کا عزم اور ارادہ ہر مسلمان پر واجب ہے - اسکے عزم اور طلب سے بھی اگر دل خالی ہوگیا تو وہ مومن نہیں ہے ، منافق ہے -

ترمذی میں ہے - (ایک مرتبہ صحابہ کی ایک جماعت میں اس بات کا چرچا ہوا ” اے اعمال احب الی اللہ “ ؟ ساری نیکیوں اور عبادتوں میں سب سے زیادہ کونسا عمل اللہ کے نزدیک محبوب و مقبول ہے ؟ اسپر سورہ صف نازل ہوئی (۱)

ان الله يحب الذين يقاتلون في سبيله صفا كأنهم بنيان مرصوص
اللہ تعالیٰ تو اُن لوگوں کو محبوب سمجھتا ہے جو اُسکی راہ میں صفا باندھکر اس استقامت اور جماؤ سے لڑتے ہیں ، گویا ایک دیوار ہے جو تلواروں کے سامنے کھڑی کر دی گئی ہے ، اور دیوار بھی کیسی ؟ ایسی جسکی ہر اینٹ دوسری اینٹ سے سیسہ ڈالکر جوڑ دی گئی ہو !

(۱) و اخرجہ ایضا امام احمد عن عبد الله بن سلام ، و ابن ابی حاتم و ابن حبان ، و الحاکم و قال صحیح علی شرط الصحیحین ، و البیہقی فی شعب الایمان و السنن ، و الطبري فی التفسیر -

پھر اسی سورۃ میں آگے چل کر فرمایا - یہی وہ عمل ہے جسے کرنے کے بعد تمام گناہ بخش دیے جاتے ہیں - کوئی خطا ، کوئی معصیت ، کوئی برائی باقی نہیں رہتی - ابدی نجات کا دروازہ ہمیشہ کیلیے کھل جاتا ہے : یا ایہا الذین آمنوا - هل ادکم علی تجارة تنجیکم من عذاب الیم ؟ تؤمنون باللہ ورسولہ ، و تجاهدون فی سبیل اللہ باموالکم و انفسکم ، ذلکم خیر لکم ان کنتم تعلمون - یغفر لکم ذنوبکم ، و یدخلکم جنات تجری من تحتہا الانہار ، و مساکن طیبۃ فی جنات عدن - ذلک الفوز العظیم !

بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہ سے مروری ہے - آنحضرت سے سوال کیا گیا - ” اے العمل افضل “ ؟ کونسا عمل سب سے زیادہ فضیلت رکھتا ہے ؟ فرمایا ” ایمان باللہ ورسولہ “ اللہ اور اسے رسول پر ایمان لانا - پوچھا - ” ثم ما ذا “ ؟ اس کے بعد ؟ - فرمایا ” الجہاد فی سبیل اللہ “ -

حد ہو گئی کہ جن لوگوں نے جنگ بدر میں جاں نثاریں کی تھیں ، اگر کبھی ان سے کوئی لغزش ہو گئی اور معصیت میں مبتلا ہو گئے تو آپ سے سزا دینے سے انکار کر دیا اور فرمایا ” لعل اللہ اطع علی اہل بدر فقال اعملوا ما شئتم “ یہ وہ جاں نثار حق ہیں جنہوں نے جنگ بدر میں شرکت کی ہے - عجب نہیں کہ اس ایک عمل کے صلے میں اللہ نے ان کی ساری پچھلی اور آئندہ خطائیں بخش دی ہوں اور کھدیا ہو کہ جو جہی میں آئے کرو !

ترمذی میں ہے ” من رابط لیلة فی سبیل اللہ “ کانت لہ کالف لیلة میامہا و قیامہا “ جس مسلمان نے ایک رات بھی جہاد کرتے ہوئے دشمن کے انتظار میں کاٹی ، اس کے لیے ایسا اجر ہے ، گویا ہزار دنوں کا روزہ اور ہزار راتوں کی عبادت !

اور فرمایا ” مقام احدکم فی سبیل اللہ خیر من عبادۃ احدکم فی اہلہ ستین سنة “ (ترمذی) ساٹھ برس تک اپنے گھر میں عبادت کرنے سے بھی یہ افضل ہے کہ جہاد کے میدان میں کھڑے نظر آؤ -

اور فرمایا ” حرس لیلة فی سبیل اللہ “ افضل لہ من الف لیلة ، یقام لیلہا و یصام فہارہا “ (رواہ احمد) جہاد کی ایک رات اس سے افضل ہے کہ ہزار راتیں عبادت میں اور ہزار دن روزہ میں بسر کیے جائیں !

اور فرمایا ” حرمت النار علی عین دمعته من خشية الله “ و حرمت النار علی عین سہرت فی سبیل اللہ “ (ایضاً) جو آنکھ اللہ کے خوف سے اشکبار ہوئی، یا جہاد میں کام کرتے ہوئے جاگی، اسپر درخ کی آگ حرام ہے ! ایک شخص نے پوچھا - یا رسول اللہ ! کرئی ایسا عمل بتلا دیجیے کہ مجاہدین کا ثواب حاصل ہو - فرمایا ” هل تستطيع ان تصلي فلا تفتر “ و تصوم فلا تفطر ؟ ” اسکی طاقت رکھتے ہو کہ برابر نماز پڑھتے رہو اور قضا نہرو، برابر روزہ رکھتے رہو، اور کبھی بیچ میں افطار نہ کرر ؟ عرض کیا ” انا اضعف من ان استطیع ذلک “ یہ تو میری طاقت سے باہر ہے - فرمایا ” فالذي نفسي بيده ! لو طوقت ذلک “ ما بلغت فضل المجاہدين فی سبیل اللہ - اما علمت ان فرس المجاہد لیستن فی طوله فيکتب له بذلك الحسنات ؟ ” خدا کی قسم ! اگر تم ایسا کرنے کی طاقت بھی رکھتے اور کر دکھاتے، جب بھی اُن لوگوں کی فضیلت کہاں پاسکتے تے جو اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں ؟ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ مجاہد کا گھوڑا بندھا رہتا ہے، اور اسکے لیے بھی اسکے نامۂ اعمال میں نیکیاں درج ہوتی رہتی ہیں ؟ (رواہ احمد و الحاکم و قال علی شرط الصحیحین)

بخاری و مسلم میں ہے - تین مرتبہ آپ سے پوچھا گیا - ” ما يعدل الجہاد فی سبیل اللہ ؟ تینوں مرتبہ فرمایا ” لا تستطيعونه “ پھر فرمایا ” مثل المجاہد کمثل الصائم القائم القانت بایات اللہ لا یفتر عن صلاته ولا صیامه حتی یرجع “

اور فرمایا ” من اغبرت قد ماہ فی سبیل اللہ ساعة من نہار، فہما حرام علی النار “ (رواہ احمد) جس کے پاؤں اللہ کی راہ میں ایک گھنٹہ کیلیے بھی گرد آلود ہوئے، درخ کی آگ اُن قدموں پر حرام ہے -

اور فرمایا ” ما من میت يموت الا ختم عمله “ الا من مات مرابطا فی سبیل اللہ، فانہ ینمو له عمله الی یوم القیامة و امن من فتنة القبر “ (رواہ اصحاب السنن) کرئی ایسی موت نہیں جسکے سانچہ اعمال کا سلسلہ بھی ختم نہ ہو جانا ہو، الا وہ شخص کہ جہاد کی راہ میں دشمن کے حملے کا انتظار کرتا ہوا دنیا سے گیا - سو اسکا عمل ایسا ہے جو مرنے کے بعد بھی قیامت تک بڑھتا رہیگا - یعنی عمل جہاد بھی حسنات جاریہ میں سے ہے - حسنات جاریہ بموجب نص حدیث مسلم تین ہیں -

اولاد صالح، علم نافع، اوقاف و تعمیرات خیرہ - مثلاً مساجد و مدارس وغیرہ جو بعد کو باقی رہیں - اس حدیث اور اسکی ہم معنی احادیث سے معلوم ہوا کہ جہاد کا ہر کلم بھی اسی قسم میں داخل ہے - علت اسکی بالکل واضح ہے - عمل جہاد کی بنیاد ہی یہ ہے کہ اپنے بعد کے زمانے اور آنے والی نسلوں کی حفاظت و سعادت کیلئے اپنا وجود قربان کر دیا جائے - پس کوئی عمل نہیں جو اس سے زیادہ سچی اور بے لاگ انسانی خدمت اور نوع پرستی کے جذبات رکھتا ہو - اور اسی لیے ضروری ہوا کہ اسکا اجر بھی وقتی نہر، دائمی ہو - عمل کا اجر تو عمل کے نتائج پر موقوف ہے - جب نتائج بعد کے زمانوں اور نسلوں کو ملینگے، تو صاحب عمل کا اجر بھی فوراً کیوں منقطع ہو جائے ؟ اس حدیث میں ”مربطاً فی سبیل اللہ“ کا لفظ آیا ہے - اور دوسری حدیثوں میں بھی جا بجا ”رباط“ کا لفظ وارد ہے - ”رباط“ سے مقصود یہ ہے کہ کسی مقام میں ٹھہر کر دشمن کے حملہ کا انتظار کرنا - تاکہ جب دشمن آجائے تو اللہ کی راہ میں مقابلہ کیا جائے - نہایہ میں ہے ”ہو الاقامة فی مکان یتوقع هجوم العدو فیہ لقصده دفعه للہ“ پس ”مربطاً فی سبیل اللہ“ کا مطلب یہ ہوا کہ اگر لوکر شہید ہونے کا موقعہ نہیں بھی ملا، اور حملہ کے انتظار ہی میں موت آگئی، جب بھی اسکا اجر مرنے کے بعد برابر بڑھتا رہیگا - اررہ ہزار دنوں کے روزہ و نماز سے افضل ہے !

قوان بھی ہر جگہ اور بار بار یہی کہتا ہے :

الذین آمنوا وهاجروا وجاهدوا
فی سبیل اللہ باموالہم
وانفسہم اعظم درجۃ عند اللہ
واولئک ہم الفائزون -
یبدھم ربھم برحمۃ منہ
ورضوان و جنات لھم فیہا نعیم
مقیم - خالدین فیہا ابد -
ان اللہ عندہ اجر عظیم !
(۲۳ : ۹)

جو لوگ ایمان لائے، حق کی راہ میں
اپنا گھر بار چھوڑا، اپنی جان و مال سے
جہاد کیا، سر اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ
اور اونچا درجہ انہی کا ہے - یہی لوگ
ہیں کہ دنیا اور آخرت میں کامیاب ہونگے -
اللہ کی طرف سے انکے لیے بشارت ہے -
اسکی رحمت، اسکی محبت، بہشتی
زندگی کی نعمتیں، اور انکی دائمی اور
ہمیشگی، سب کچھ انہی کیلئے ہے !

ابن ماجہ میں ہے ”من ارسل بنفقۃ فی سبیل اللہ و اقام فی بوثہ، فلہ بكل درہم سبع مائۃ درہم“ و من غزا بنفسہ فی سبیل اللہ و اتفق فی رجھہ ذلک،

فلہ بکل درہم سبع مائۃ الف درہم - ثم تلا هذه الاية - والله يضاعف لمن يشاء یعنی جو مسلمان ایسے وقتوں میں گھر سے نہ نکلا، صرف اپنے رویہ سے جہاد میں مدد دی، تو اسکو ہر ایک رویہ کے بدلے سات سو روپیوں کا اجر ملیگا۔ یعنی اس اتفاق میں سات سو درجہ زیادہ اجر ہے۔ اور جس نے رویہ بھی لگایا اور خود شریک کار بھی ہوا، تو اسکے لیے سات ہزار درجہ زیادہ اجر۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی ”اللہ جس کسی کا اجر و ثواب چاہتا ہے“

اسلام نے حقوق العباد پر جس قدر زور دیا ہے، معلوم ہے۔ علی الخصوص والدین اور اقرباء کے حقوق کہ ساری نیکیوں اور ہر طرح کی عبادتوں سے مقدم ٹھہرائے گئے۔ لیکن صرف یہی وہ عمل عظیم ہے جسکے لیے یہ حقوق بھی رک نہیں ہو سکتے۔ امت اور شریعت کی حفاظت ہی پر تمام افراد کی حفاظت موقوف ہے۔ پس اگر امت دشمنوں کے نرغہ میں ہے، تو نیکی کا سب سے بڑا کام جو زمین پر ہو سکتا ہے مسلمانوں کے سامنے آگیا۔ اب اس بڑے کام کے لیے سارے چھوٹے کام چھوڑ دینے چاہئیں۔ ماں، باپ، بھائی، بہن، بیوی، بچے، رشتے نائے، اپنی اپنی جگہ سب حق ہیں۔ سب کا حق ادا کرنا چاہیے۔ لیکن خدا اور اسکی سچائی کا حق سب سے بڑا حق ہے۔ اسکے رشتہ کے سامنے سارے رشتے ہیچ ہیں۔ پس اگر اسکے کام کا وقت آگیا تو سب کو اسکی خاطر چھوڑ دینا پڑیگا :

قل ان کان اباؤکم، و ابناءؤکم،	مسلمانوں سے کہدو کہ تمہارے والدین
و اخوانکم، و ازواجکم، و عشیرتکم،	تمہاری اولاد، تمہارے بھائی، تمہاری
و اموال اقربوتمoha، و تجارتاؤ	بیویاں، تمہارا خاندان اور اسکے تمام رشتے
تخشرون کسانها، و مساکن	یہ مال و متاع جو تم نے کمایا ہے، یہ کاروبار
ترضونها، احب الیکم من اللہ	و تجارت جسکے مندا پر جانے سے تم قرتے
و رسولہ و جہاد فی سبیلہ فترضوا	ہو، یہ تمہارے رھنے کے محل جن میں
حتیٰ یاتیی اللہ بامرہ و اللہ	تمہارا دل اٹکا ہوا ہے، اگر تمہیں اللہ اور
لا یدعی القوم الفاسقین (۲۵: ۹)	اسکے رسول اور اسکی راہ میں جہاد کرنے

سے زیادہ پیارے ہیں، اور تمہارے پاؤں ان زنجیروں میں ایسے بندھ گئے ہیں کہ اللہ کی پکار بھی انہیں نہیں ہلا سکتی، ترجان لو کہ اللہ کا کام بھی تمہارا محتاج نہیں۔ نتائج کا انتظار کرو۔ یہاں تک کہ اللہ کو جو کچھ کرنا منظور ہے کر دکھائے۔ اللہ کا قانون ہے کہ وہ نافرمانوں پر کامیابی کی راہ نہیں کھولتا !

اگرچہ عمل کے اعتبار سے اس فرض کی تعمیل اُس وقت لازم سے لازم ہو جاتی ہے جب حملہ اعداء کی وجہ سے خاص طور پر ضرورت پیش آجائے، لیکن عزم و استعداد کے لحاظ سے یہ حکم کسی خاص وقت میں محدود نہیں - ہمیشہ اور ہر حال میں مسلمانوں کا فرض ہے کہ دفاع اعداء کیلئے طیارہیں اور طیارے کرتے رہیں - اور ہر حدیث گزر چکی ہے کہ جو دل اسکے عزم و طلب سے خالی ہوا، اُس پر ایمان کی جگہ نفاق کا قبضہ ہو گیا:

و اعدوا لهم ما استطعتم من قوة جسدہ بھی تم سے ممکن ہو دشمنوں
و من رباط الخيل ترهبون به کے مقابلے کیلئے اپنی قوت اور ساز
عدو الله وعدوكم و آخرين من سامان سے طیارہ ہو - تا کہ اللہ اور اُسکی
دولہم لا تعلمونہم (۸ : ۶۰) اُمت کے دشمنوں پر تمہاری مستعدی
دیکھ کر خوف اور رعب چھا جائے - تم پر حملہ کرنے کی ہر کسی کو جرأت نہ ہو -
(عہد نبوت کا ایک واقعہ)

یہ قرآن و سنت کے احکام ہیں - اب دیکھیں، صاحب شریعت کا اس بارے میں طرز عمل کیا رہا ہے ؟

ہجرت کے نوریں سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ملی کہ رومیوں کی فوج مسلمانوں پر حملہ کرنے کیلئے اکٹھی ہو رہی ہے - یہ سنکر آپؐ بھی طیارے کا حکم دیدیا " اور تیس ہزار مجاہدین کے ساتھ مدینہ سے کوچ کر دیا - چونکہ یہ فوج بڑی ہی تنگدستی اور بے سروسامانی کے حال میں نکلی تھی - اٹھارہ آدمیوں کے حصے میں صرف ایک سواری آئی تھی - جنگل کے پتے کہا کر مسلمانوں نے گزارہ کیا، اسلئے اس فوج کا نام "جیش العسرة" مشہور ہوا - الذین اتبعوا فی ساعة العسرة (۱۱۹ : ۹)
آج تم خدا اور اُسکے ایمان کی جگہ لوہے اور گندھک کے سامان و اسلحہ کی پرستش کر رہے ہو - لیکن ایک وقت رہے بھی تھا، جب بے سرو سامان مسلمانوں کی یہ بھیڑ نکلی تھی، تا کہ کرۂ ارضی کی سب سے بڑی متمدن قوم یعنی رومیوں سے مقابلہ کرے !

حضرت ابوبکر (رض) نے اسی دفاع کیلئے اپنا تمام مال و متاع پیش کر دیا تھا - جب اُنسے پوچھا گیا " ما ابقیت لاهلک " ؟ اپنے بیوی بچوں کیلئے کیا چھوڑ آئے ہو ؟ تو اس پیکر ایمان و مجسمہ عشق حق نے جواب دیا تھا " ابقیت لهم اللہ و رسولہ " ! اللہ اور اُسکے رسول کو !

آنکس کہ ترا بخواست ، جانرا چہ کند ؟
 فرزند ر عیال ر خانمان را چہ کند ؟
 دیوانہ کنی ہر نہر جہانش بخشی
 دیوانہ تو ہر نہر جہان را چہ کند ؟

تبرک نامی مقام پر پہنچے تو معلوم ہوا مسلمانوں کی دلیرانہ طیاروں کا حال سنکر رومیوں کے حوصلے پست ہو گئے اور فوجیں منتشر کر دی گئیں۔ آنحضرتؐ نے ایک ماہ قیام فرمایا اور پھر مدینہ واپس آ گئے۔

اس دفاع میں بجز منافقین کے تمام مسلمان شریک ہوئے تھے۔ صرف تین شخص نہ جاسکے۔ کعب بن مالک۔ ہلال بن امیہ۔ مرارہ بن ربیع۔ کعب بن مالک سابقین انصار میں سے ہیں، اور ان ۷۳ سابقین مخلصین میں سے جو عقبہ کی بیعت میں حاضر ہوئے تھے۔ انکے ایمان و اخلاص میں کیا شبہ ہوسکتا ہے؟ انکا شریک نہ ہونا کسی بری نیت سے نہ تھا۔ سستی اور کاہلی سے آج کل کرتے رہے اور فوج کے ساتھ ملنے کا موقعہ نکل گیا۔

با ایں ہمہ یہ معاملہ اللہ اور اس کے رسول کی نظروں میں اسدرجہ اہم ہے کہ یہ سستی اور کاہلی بھی ایک سخت جرم قرار پائی۔ معذرت کرنے کیلئے حاضر ہوئے تو توبہ قبول نہ ہوئی۔ حکم ہوا کہ گھر میں بیٹھو اور فیصلہ رچی کا انتظار کرو۔ مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ تمام تعلقات ان سے ترک کردیں۔ نہ کوئی بات چیت کرے۔ نہ ملے جلے۔ نہ آؤر کسی طرح کا واسطہ رکھے۔ پھر انکی بیویوں کو حکم ملا کہ وہ بھی الگ ہوجائیں اور کوئی واسطہ نہ رکھیں۔ امام بخاری نے ایک طویل طویل روایت خود حضرت کعب بن مالک کی زبانی نقل کی ہے اور اس واقعہ کیلئے خاص باب باندھا ہے۔ کعب کہتے ہیں۔ ہمارا یہ حال ہو گیا تھا کہ سارا مدینہ انسانوں سے بھرا تھا، مگر ہمارے لیے نہ ایک آنکھ دیکھنے والی تھی نہ ایک زبان بات کرنے والی۔ خود عزیز اقارب نے ملنا چلنا ترک کردیا تھا۔ حسرت سے ایک ایک کا منہ تکتے اور دیوانوں کی طرح پھرتے تھے۔ ایک دن اچھے چھپرے بھائی ابو قتادہ کے یہاں گیا۔ مجھے دیکھتے ہی منہ دوسرے طرف پھرا لیا۔ سلام کیا تو جواب نہ ملا۔ اللہ اللہ! کیا مسلمان تھے کہ انکا رشتہ تھا تو اللہ اور اس کے رسول کا رشتہ۔ زندگی تھی تو صرف اسی کے حکم پر! العجب فی اللہ والبغض فی اللہ کی مجسم تصویر تھے!

غسان کے عیسائی پادشاہ نے یہ حال سنا تو خوش ہوا کہ مسلمانوں میں یہوتِ قائلہ کا اچھا موقعہ نکل آیا ہے۔ کعب کے نام اس مضمون کا خط بھیجا کہ تمہارے آقا نے تمہاری ساری عمر کی خدمتوں کا یہ معارضہ دیا۔ میرے پاس چلے آؤ۔ دیکھو یہاں تمہاری کیسی عزت ہوتی ہے؟ کعب بن مالک کو خط ملا تو ایلچی کے سامنے آگ میں چھونک دیا اور کہا جواب میں کہہ دینا۔ ہم نے جس آقا کی چرکھت پر سر رکھا ہے، اسکی گیرائیوں اور دلربائیوں کا حال تمہیں کیا معلوم؟ اُسکی بے التفاتی بھی دوسروں کی محبت و عزت سے ہزار درجہ ہمیں زیادہ عزیز ہے :

اے جفا ہاے تو خوشتر ز رفاے دگران !

ان مومنین صادقین کی یہ آزمائش پورے پچاس دن تک جاری رہی۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے توبہ قبول فرمائی اور سورہ توبہ کی یہ آیت نازل ہوئی :

و علی الثلثة الذین خلفوا، حتی ضاقت علیہم الارض بما رحبت و ضاقت علیہم انفسہم و ظنوا ان لا ملجاء من اللہ الا الیہ۔ ثم تاب علیہم لیتوبوا۔ ان اللہ هو الثواب الرحیم ! (۱۲۰ : ۹)

اور رہ تین آدمی جنکا معاملہ فیصلہ الہی کیلئے ملتوی کر دیا گیا تھا، سر جب انکا یہ حال ہو گیا کہ تمام مسلمانوں نے اُنکو چھوڑ دیا، زمین باوجود اپنی وسعت کے انپر تنگ ہو گئی، اپنی زندگی سے بیزار ہو گئے، اور اُنہوں نے دیکھ لیا کہ اللہ سے پناہ نہیں ہے مگر صرف اسی کی طرف، تو پھر اللہ نے انکی توبہ قبول کر لی۔ یقیناً اللہ ہی ہے جو توبہ قبول کرتا اور خطا کاروں کیلئے مہربانی رکھتا ہے !

حضرت کعب کو جب قبولیت توبہ کی بشارت ملی تو بے اختیار سجدہ میں گر پڑے اور اپنا سارا مال و متاع شکرانۂ قبولیت میں لٹا دینا چاہا۔

اس واقعہ میں متعدد باتیں قابل غور ہیں :

(۱) رومیوں نے حملے کی طیاریاں کیں تو اسلام و امت کی حفاظت کیلئے دفاع کرنا ہر مسلمان پر فرض ہو گیا۔ موسم سخت گرمی کا تھا۔ سفر دور دراز کا۔ بے سروسامانی حد درجہ کی۔ مقابلہ اس حکومت سے جو نصف دنیا پر حکمران تھی۔ حجاز میں فصل پک چکی تھی اور کٹائی کا اصلی وقت تھا۔ یہی فصل ملک کیلئے سال بھر کی خوراک تھی۔

اگر مشغلوں اور مجبوریوں کے عذر سننے جاسکتے ہیں تو ان حالات سے بڑھکر اگر کوئی حالت عذر داری کے لیے مناسب ہو سکتے ہیں ؟ مگر دفاع کا فرض ایسا سخت اور اٹل ہے کہ نہ کوئی عذر سنا گیا ، نہ کوئی مشکل رکاوٹ ہو سکی ۔ حکم ہوا کہ سب کچھ چھوڑ دو ۔ ساری مصیبتیں جھیل لو ۔ اور دشمنوں کو روکنے کیلئے نکل کھڑے ہو ۔ سورہ توبہ میں اسکا بڑا ہی عبرت انگیز تذکرہ ہے ۔ یہ موقعہ تفصیل کا نہیں ۔ قالوا لاتنفرُوا فی الحر ۔ قل نار جهنم اشد حرا

لو كانوا یفقهون [۹ : ۸۳]

(۲) یہ تینوں مسلمان جو شرکت دفاع سے رہ گئے ، مخلصین مومنین میں سے تھے ۔ انکی زندگیاں اسلام کی بے شمار خدمتوں اور جان نثاریوں میں بسر ہوئی ہیں ۔ عبادتوں اور نیکیوں کا کیا پوچھنا کہ شب و روز اللہ کے رسول کے سایہ تربیت میں رہتے تھے ، انہی کے پیچھے نمازیں پڑھتے تھے ، انہی کے ساتھ روزے رکھتے تھے ۔ صحابہ کے ایک ادنیٰ فرد کی عبادت کا مقابلہ ہم اپنی پوری نسلوں اور قوموں کی عبادت گزاریاں پیش کر کے بھی نہیں کر سکتے ۔ حضرت کعب بن مالک سابقون الاولون میں سے ہیں ۔ جب اسلام کا کوئی ساتھی نہ تھا تو مدینہ کے انصار نے ساتھ دیا ۔ عقبہ کی بیعت ثانیہ میں ۷۳ جان نثاروں نے بیعت کی تھی ۔ یہ انہی عشاق اسلام میں سے ہیں ۔ خود کہتے ہیں کہ کسی اسلامی خدمت میں دوسروں سے پیچھے نہ رہا ۔ ہرجنگ میں شرکت کی ۔ ہر موقعہ پر جان و مال نثار کیا ۔ اس دفاع کی شرکت سے بھی جو رہ گئے ، تودل کی کسی کمزوری اور نیت کے فساد کی وجہ سے نہیں ۔ چلنے کا تو پورا سامان کر لیا تھا ۔ صرف یہ قصور ہوا کہ سستی اور کاہلی کی ۔ پوری طرح مستعدی سے کام نہ لیا ۔ تاہم دیکھو ، یہ سستی اور کاہلی بھی خدا کے حضور کیسا بڑا جرم قرار پائی کہ نہ تو کوئی پچھلی خدمت آئے آسکی ، نہ مدۃ العمر کی نیکیوں اور عبادتوں ہی نے کچھ کام دیا ۔ نہ کوئی بزرگی اور بڑائی اس معاملہ میں شفیع ہو سکی ۔ نہ ایک ایسے بکے اور پرکے ہرے مخلص مسلمان کیلئے عذر و معذرت کی گنجائش نکل سکی ۔ سخت سے سخت سزا جو دی جاسکتی تھی ، دی گئی ۔ مسلمانوں سے اسلامی برادری کا رشتہ ہی توڑ دیا گیا ۔ پچاس دنوں کیلئے جماعت سے باہر کر دیے گئے ۔ یہ سارا زمانہ گریبہ و زاری اور عبادت و استغفار میں بسر ہوا ۔ تب کہیں جاکر توبہ قبول کی گئی ۔

(۳) اسلام کے احکام کا قبولیت توبہ کے بارے میں جو حال ہے، معلوم ہے۔ خدا کا دروازہ رحمت کسی آنے والے کا اتنا انتظار نہیں کرتا، جسقدر اس مضطرب روح کا، جو توبہ کیلئے آسکی طرف بڑھے۔ ”لو اخطاتم حتی تملأ خطایا کم ما بیسن السماء و الارض، ثم استغفرتم، اللہ یغفر لکم“ (رواہ مسلم عن ابی ہریرہ) اگر تم نے اتنے گناہ کیے ہوں کہ زمین و آسمان کا فاصلہ ان سے بھر دیا جاسکے، پھر بھی توبہ کا آنسو بہائے ہوئے آؤ تو دروازہ مغفرت کھلا پاؤ گے۔ لیکن دیکھو، امت کی حفاظت و مدافعت سے غفلت کرنا اللہ کی نظاروں میں کیسا سخت جرم ہے کہ یکایک توبہ بھی قبول نہ ہوئی۔ تینوں صحابی آپکی واپسی کے بعد پہلی ہی صحبت میں عفو تقصیر کیلئے حاضر ہو گئے تھے، مگر حکم ملا کہ ابھی نہیں۔ انتظار کرو۔ پچاس دن سزا و عقوبت کے گزر چکے تب کہیں توبہ قبول ہوئی !

(۴) جب ان پاک انسانوں کا یہ حال ہوا کہ ایمان انکا ایمان تھا، اور نیکیاں انکی نیکیاں۔ ان کے بستر خواب کے اجر و ثواب کا بھی ہماری بڑی بڑی عبادتیں مقابلہ نہیں کر سکتیں، تو خدا را بئلاؤ، ہم بدبختوں اور سیہ کاروں کا کیا حشر ہوگا کہ نہ ایمان کی دولت ساتھ ہے نہ طاعت و حسنات کی پونجی دامن میں۔ زندگی یکسر برباد غفلت و معصیت، اور عمریں یکقلم تاراج نفس پرستی و نافرمانی۔ رہاں عزم و ایمان کے ساتھ سہر و نسیان تھا مگر عذر قبول نہ ہوا۔ یہاں اعراض و نفاق کے ساتھ صریح نافرمانی و انکار ہے اور پھر نہ ندامت ہے نہ توبہ و انابت ! انکے ساتھ سب کچھ تھا اور کام نہ آیا۔ ہمارے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔ پھر کیا ہے جس نے آنے والے دن کی طرف سے ہماری روحوں کو بے فکر کر دیا ہے اور ہمارے غافل دلوں پر بیخوفی کی موت چھا گئی ہے ؟ بئلاؤ، زمین و آسمان میں کون ہے جو اس دن ہمیں بچا سکیگا جب خدا کے غضب کا ہاتھ ہماری طرف بڑھینگا ؟ یقول الانسان یومئذ این المفر ؟

(ایک عام غلط فہمی)

البتہ یاد رہے کہ ”جہاد“ کی حقیقت کی نسبت سخت غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ جہاد کے معنی صرف لڑنے کے ہیں۔ مخالفین اسلام بھی اسی غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے۔ حالانکہ ایسا سمجھنا اس عظیم الشان مقدس حکم کی وسعت کو بالکل

محدود کر دینا ہے۔ ”جہاد“ کے معنی کمال درجہ کوشش کرنے کے ہیں۔ قرآن و سنت کی اصطلاح میں اس کمال سعی کو جزائی اغراض کی جگہ حق پرستی اور سچائی کی راہ میں کی جائے ”جہاد“ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ یہ سعی زبان سے بھی ہے، مال سے بھی ہے، صرف وقت و عمر سے بھی ہے، محنت و تکالیف برداشت کرنے سے بھی ہے، اور دشمنوں کے مقابلے میں لڑنے اور اپنا خون بہانے سے بھی ہے۔ جس سعی کی ضرورت ہو، اور جو سعی جسکے امکان میں ہو، اُس پر فرض ہے۔ اور جہاد فی سبیل اللہ میں لغۃ و شرع، دونوں اعتبار سے داخل۔ یہ بات نہیں ہے کہ ”جہاد“ سے مقصود مجرد لڑائی ہی ہو۔ جہاد تو دل سے بھی ہے، زبان سے بھی ہے، ہاتھ سے بھی ہے۔ دشمنوں کی فوج سے ایک خاص وقت ہی میں مقابلہ ہو سکتا ہے، لیکن ایک مومن انسان اپنی ساری زندگی اور زندگی کی ہر صبح و شام جہاد حق میں بسر کرتا ہے ”المجاهد من جاهد نفسه فی ذات اللہ“ و المہاجر من ہجر ما نہی اللہ عنہ“ سورۃ فرقان میں ہے فلا تطع الکافرین و جاهد ہم بہ جہاداً کبیراً (۲۵: ۵۵) یعنی کفار کے مقابلہ میں کمال درجہ جہاد کر۔ سورۃ فرقان بالاتفاق مکی ہے، اور معلوم ہے کہ جہاد بالسیف یعنی لڑائی کا حکم ہجرت مدینہ کے بعد ہوا۔ پس مکی زندگی میں کونسا جہاد تھا جس کا اس آیت میں حکم دیا جا رہا ہے؟ جہاد بالسیف تو ہو نہیں سکتا۔ یقیناً وہ حق کی استقامت اور اسکی راہ میں تمام مصیبتیں اور شدتیں جھیل لینے کا جہاد تھا۔ مکی زندگی میں جس طرح یہ جہاد جاری رہا، معلوم ہے۔ حق کی راہ میں دنیا کی کسی جماعت نے ایسی تکلیفیں اور مصیبتیں نہیں اٹھائیں، جیسی اللہ کے رسول اور اُسکے ساتھیوں نے مکی زندگی میں۔ اسی پر جہاد کبیر کا اطلاق ہوا۔ اسی طرح منافقوں کے ساتھ بھی جہاد کرنے کا حکم دیا گیا ”جاہد الکفار و المنافقین و اغلظ علیہم“ (۹: ۶۶) حالانکہ منافق تو خرد اسلام کے ماتحت مقہورانہ و محکومانہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ جنگ و قتال کی ضرورت ہی نہ تھی، اور نہ اُنسے جنگ کی گئی۔ سو یہ جہاد بھی تبلیغ حق و اتمام حجت و مقارمۃ فساد کا جہاد تھا جو قلب و زبان سے تعلق رکھتا ہے۔ بخاری و ابن ماجہ میں ہے کہ حضرت عائشہ نے پوچھا ”علی النساء جہاد؟“ کیا عورتوں کیلئے بھی جہاد ہے؟ فرمایا ”نعم جہاد“ لا قتال فیہ۔ الحج و العمرة“ ہاں، جہاد ہے مگر اسمیں

لڑنا نہیں ہے - حج اور عمرہ - اس حدیث میں اُس سعی اور ترکِ وطن کی محنت کو جو حج و عمرہ میں پیش آتی ہے ، عورتوں کیلئے جہاد فرمایا ، اور کہا ایسا جہان جسمیں لڑائی نہیں - اُس سے معلوم ہوا کہ لڑائی کے الگ کر دینے کے بعد بھی حقیقت ”جہاد“ باقی رہتی ہے -

اگر اُمت کیلئے دفاع و جنگ کا وقت آگیا ، یا کسی جماعت مفسدین ارض پر امام نے حملہ کیا ، تو ایسے وقتوں میں بھی صرف نفس جنگ ہی نہیں بلکہ سعی و کوشش کی ساری باتیں شریعت کے نزدیک جہاد ہیں - جسکی طاقت میں جنگ کرنا نہیں ہے اور اُس نے مال دیا تو وہ بھی مجاہد ہے - جس نے اس راہ میں اُس کسی طرح کی تکلیف و محنت اٹھائی ، وہ بھی مجاہد ہے - البتہ ایسے وقتوں میں اگر کوئی مسلمان لڑائی کی طاقت رکھتا ہے اور اس سے پہلے تہی کرے ، تو اُسکا کوئی عذر نہیں سنا جائیگا - اسکا شمار مومنوں کی جگہ منافقوں میں ہوگا - جو مال دے سکتا ہے اور نہ دیا ، تو وہ بھی ایمان و اخلاص کی زندگی سے نکل گیا - زمین پر گو مسلمان کہلائے پر اللہ کے حضور منافق کہلائیگا - جس شخص کی زبان اعلانِ حق اور دعوتِ الی الجہاد میں کھل سکتی ہے مگر نہ کھلی ، تو اُس نے بھی ایمان چھوڑ کر نفاق کی راہ اختیار کر لی - گو شیطان حیل و نفسِ خادع اسکو ہزاروں فریب دیتا رہے - ”افضل الجہاد کلمۃ حق عند سلطان جائز“ (راہِ الترمذی و ابو داؤد و ابن ماجہ و ابن حبان) سب سے زیادہ فضیلت رکھنے والا جہاد وہ کلمۃ حق ہے جو شاہانِ جور و ظلم کے سامنے بے باکانہ کہا جائے -

اور پھر ان سب سے بالا تر مرتبہ اُن مجاہدین کا ملین اور اصحابِ عزیزۃ عمل کا ہے ، جنکی زندگی سرتا سر جہاد فی سبیل اللہ ، اور جملکا رجوں یکسر خدمتِ حق ، و شیفتگیِ صدق ، و عشقِ دعوت ہے - جو اس عمل مقدس کیلئے کسی خاص صدائے فغیر اور اعلانِ وقت کے منتظر نہیں رہتے - بلکہ ہر صبح جو اُنپر آتی ہے ، جہاد فی سبیل اللہ کی صبح ہوتی ہے ، اور ہر شام کی تاریکی جو اُنپر پھیلتی ہے ، وہ اسی راہ کی شام ہوتی ہے - اُنکی زندگی پر کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرتا جو جہاد کے مرتبہ علیا و فضیلة عظمیٰ کے اجر و ثواب سے خالی ہو - کائنات ہستی کے ہر عمل کی طرح یہ عمل بھی تین عنصر سے مرکب ہے - دل ، زبان ، اعضا و جوارح - سو اُنکا دل ہمیشہ عشقِ حق اور عزمِ مقصد کی آتش شوق میں پھنکتا رہتا ہے - لہٰذا

زبان ہمیشہ اعلان حق، و دعوت الی اللہ، اور دفع و مقارمۃ کفر و ضلالت میں مشغول رہتی ہے۔ اُنکے ہاتھ اور اُنکے تمام جوارح کبھی اس راہ کی سعی و محنت سے نہیں تھکتے۔ اسکے بعد جہاد کا کونسا کام رہ گیا جو انہوں نے نہیں کیا؟ اور کونسا مرتبہ رہ گیا جو انہوں نے نہیں پایا؟ و ذلک فضل

اللہ یؤتیہ من یشاء و اللہ ذو الفضل العظیم |

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں؟

جہاد کی اس حقیقت کو سامنے رکھ کر غور کرو، کہ انسانی اعمال کی کونسی بڑائی اور عظمت ہے جو اسکے دائرہ سے باہر رہ گئی؟ اور نفع انسانی کی ہدایت و سعادت کا کونسا عمل حق ہے جو اسکے بغیر انجام پا سکتا ہے؟ پس یہی وجہ ہے کہ شریعت نے (اسکی اہمیت و فضیلت پر) اس قدر زور دیا کہ ساری نیکیاں ساری عبادتیں اس سے پیچھے رہ گئیں۔ سب کا حکم شاخس کا ہوا۔ جڑ یہی عمل قرار پایا۔ اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل فضیلت ہو سکتی ہے کہ خود اللہ کے رسول نے فرمایا: ”و الذی نفسی بیدہ“ لودت انی اقتل فی سبیل اللہ ثم احیا، ثم اقتل ثم احیا، ثم اقتل ثم احیا، ثم اقتل“ (رواہ البخاری) خدا کی قسم! اگر ممکن ہوتا تو میں یہ چاہتا کہ اللہ کی راہ میں قتل کیا جاؤں، پھر زندہ ہوں۔ پھر قتل کیا جاؤں، پھر زندہ ہوں۔ پھر قتل کیا جاؤں، پھر زندہ ہوں۔ پھر قتل کیا جاؤں۔ تاکہ اُسکی راہ میں جان دینے کی لذت و سعادت ایک ہی مرتبہ میں ختم نہ ہو جائے!

تمنت سلیمیٰ ان نموت بحبہا

واہون شی عذنا ما تمنت!

(احکام قطعیتہ دفاع)

غرضکہ ”دفاع“ اسلام کے اُن بنیادی حکموں میں سے ہے، جنکو ایک مسلمان مسلمان رہ کر کبھی ترک نہیں کر سکتا۔ اگر ایک مسلمان کے دل میں رائی برابر بھی ایمان کی محبت باقی رہ گئی ہے، تو اُسکی طاقت سے باہر ہے کہ اللہ کی یہ صدامے حق سننے، اور اُسکا قلب غافل چونک نہ اُٹھے:

یا ایہا الذین آمنوا! مالکم مسلمانون! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ جب اذلقیل لکم انفرورا تم سے کہا جاتا ہے ”اللہ کی راہ میں نکل

فِي سَبِيلِ اللَّهِ ،
 إِثَّا قُلْتُمْ أَلَيْسَ الْأَرْضُ
 أَرْضِيَّتُمْ بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا
 مِنَ الْآخِرَةِ ؟ فَمَا مَتَاعُ
 الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ
 إِلَّا قَلِيلٌ - [۳۹ : ۹]

کہتے ہو، ”تو تمہارے قدموں میں حرکت
 نہیں ہوتی اور زمین پر دھیر ہرے جائے
 ہو؟ کیا تم نے آخرت چھوڑ کر صرف دنیا
 ہی کی زندگی پر قناعت کر لی؟ اگر
 یہی بات ہے تو یاد رکھو، جس زندگی
 پر ریجھ بیٹھے ہو، وہ تو آخرت کے مقابلہ میں
 بالکل ہی ہیچ ہے !

اسکے بعد فرمایا :

الَّا تَغْفِرُوا ، يَعَذِّبُكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا
 وَيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ،
 وَلَا تَضُرُّوهُ شَيْئًا - وَاللَّهُ عَلَى
 كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ! (۳۰ : ۹)

یاد رکھو ! اگر تم نے حکم الہی سے سرتابی
 کی، اور رقت کے آنے پر بھی راہ
 حق میں کمر بستہ نہوے، تو اللہ نہایت
 ہی سخت عذاب میں ڈال کر اسکی سزا
 دیگا، اور تمہارے بدلے کسی دوسری قوم کو خدمت اسلام کیلئے کھڑا کر دیگا -
 تم چھانٹ دیے جاؤ گے - کلمہ حق تمہارا محتاج نہیں ہے - تم ہی اپنی
 زندگی و نجات کیلئے اسکے محتاج ہو !

اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت ، انکی حکومتوں کے مٹانے، اور انکی
 آبادیوں اور شہروں کو آپس میں بانٹ لینے کیلئے کفار ایک دوسرے کے
 ساتھی اور حامی ہیں :

وَالَّذِينَ كَفَرُوا بَعْضُهُمْ
 أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ -

جن لوگوں نے راہ کفر اختیار کی، تو وہ ایک
 دوسرے کے ساتھی اور مددگار ہیں -

مسلمانوں کی مخالفت میں خزانوں کے خزانے خرچ کر دالتے ہیں :

وَالَّذِينَ كَفَرُوا يَنْفَقُونَ أَمْوَالَهُمْ
 لِيَصُدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ -

جن لوگوں نے راہ کفر اختیار کی، تو وہ حق
 کی مخالفت میں اپنا مال خرچ کر رہے ہیں -

پس مسلمانوں کی بھی سب سے بڑی اسلامی و ایمانی خصلت یہ
 قرار پائی کہ :

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ
 أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ - (۷۲ : ۹)

مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں باہم
 ایک دوسرے کے رفیق اور مددگار ہیں !

اور اسی بنا پر مسلمانوں کا فرض تھا کہ اگر دنیا کے کسی ایک اسلامی حصہ پر غیر مسلم حملہ کریں اور وہاں کے مسلمان اُنکے مقابلہ کی کافی قوت نہ رکھتے ہوں، یا بالکل مغلوب و مقہور ہو گئے ہوں، تو تمام دوسرے حصص عالم کے مسلمانوں پر فرض ہے کہ انکی یار داری و اعانت کیلئے اُسی طرح اُتھ کھڑے ہوں۔ جس طرح خرد اپنی آبادیوں کی حفاظت کیلئے اُتھتے۔ اور اپنی جان و مال سے اُسی طرح مدد دیں، جس طرح خرد اپنے گھر بار کی حفاظت کیلئے مدد دیتے۔

یہ نہ کوئی نیا مذہبی اجتہاد ہے، نہ کوئی پولیٹیکل فتویٰ۔ تمام دنیا کے مسلمان فقہ و قوانین شریعت کی جو کتابیں صدیوں سے پڑھتے پڑھائے آئے ہیں، اور جو چھپی ہوئی بازاروں میں ہر جگہ ملتی ہیں، اور جن پر خود ہندوستانی عدالتوں میں عمل کیا جا رہا ہے، ان سب میں یہ احکام موجود ہیں۔ اسلامی دینیات کا کوئی طالب علم ایسا نہیں ملیگا جو ان حکموں سے بے خبر ہو۔ اور پھر ان سب کے اوپر مسلمانوں کی کتاب اللہ ہے جو اپنے ہر پارہ اور ہر سورۃ کے اندر اس حکم کا اعلان اور اس قانون کی پکار تیرہ صدیوں سے بلند کر رہی ہے۔ نوع انسانی کی کامل بیس نسلیں گزر چکیں، اور یہ احکام اپنی یکساں، غیر مبدل، اٹل اور لا انتہا طاقت کے ساتھ مسلمانوں کے دلوں پر حکمرانی کر رہے ہیں!

”جہاد“ کی بہت سے قسموں میں سے ایک قسم ”قتال“ یعنی لڑائی ہے۔ اور اُسکی بھی دو صورتیں ہیں۔ ”ہجوم“ اور ”دفاع“۔ یعنی افسو (Offensive) اور دیفنسو (Defensive) در اصل ہجوم کی بنیاد ہی دفاع ہی ہے۔ یعنی جب تک دنیا میں عالمگیر صلح و امن اور عام اخوت قائم نہ ہو جائے، ضروری ہوا کہ حریف و مفسد قوتوں سے ہمیشہ مقابلہ جاری رکھا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا جائیگا تو دشمن مسلمانوں کو چین سے بیٹھنے نہ دینگے اور اسلام کی اشاعت اور اس کے مشن کی تبلیغ و تکمیل میں ہمیشہ مانع ہونگے۔

فقہاء کی اصطلاح میں فرائض شرعیہ کی دو قسمیں ہیں۔ ”کفایہ“ اور ”عین“۔ یہ وہی اعمال انسانی کی قدرتی تقسیم ہے جسکو ”جماعتی فرائض“ اور ”شخصی فرائض“ کے ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ”فرض

کفایہ " سے مقصود وہ احکام ہیں جو بہ حیثیت جماعت و اجتماع قوم پر فرض ہیں - نہ کہ بہ حیثیت فرد و انفراد - یعنی ایسے فرائض جو مسلمان جماعتوں اور آبادیوں کے ذمے عائد کر دیے گئے ہیں کہ انکا انتظام کر دیں - پس انتظام ہو جانا چاہیے - یہ ضروری نہیں کہ ہر فرد بہ ذات خاص اُس میں حصہ لے - اگر ایک گروہ نے ایک وقت میں انجام دیدیا تو باقی مسلمانوں پر سے اسوقت ساقط ہو گیا - جیسے تہذیب و تکفین اموات اور نماز جنازہ - البتہ ایک مسلمان کیلئے عزیمة اسی میں ہوگی کہ اداء فرض کفایہ میں بھی شخصاً حصہ لے -

دوسری قسم " اعیان " کی ہے - یعنی وہ فرائض جنکی فرضیت جماعت پر نہیں بلکہ فرداً فرداً ہر مسلمان پر عائد ہوتی ہے - اور ایک کے کرنے سے دوسرا بری الذمہ نہیں ہو جاسکتا - جیسے پانچ وقت کی نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج -

شروعاً قتال کی پہلی صورت (یعنی ہجوم و مقابلہ کا دائمی سلسلہ) فرض کفایہ ہے - ضروری نہیں کہ بہ یک وقت ہر مسلمان اس میں حصہ لے - ہر عہد میں مسلمانوں کی ایک جماعت ضرور ایسی ہونی چاہیے جو یہ فرض انجام دیتی رہے - اگر ایک جماعت انجام دے رہی ہے تو کافی ہے - جو مسلمان شریک ہوگا، اُسکے لیے بڑا اجر ہے - جو شریک نہ ہوگا، اُسکے لیے کوئی گناہ نہیں - صاحب ہدایہ (جسکا انگریزی ترجمہ بھی ہو چکا ہے اور ہندوستانی عدالتوں میں محکمتن لا کی بنیادی کتاب ہے) لکھتے ہیں :

الجهاد فرض علی الکفایہ - اذا قام فريق من الناس ، سقط عن الباقيین * * فان لم یقم به أحد ، اثم جميع الناس بتركه - لان الوجوب علی الكل (کتاب السیر)

جہاد فرض کفایہ ہے - جب مسلمانوں کی کوئی ایک جماعت اس کے لیے کھڑی ہوگئی، تو باقی مسلمانوں کیلئے ضروری نہ رہا - لیکن اگر کوئی گروہ اس کے لیے نہ آٹھا، تو پھر تمام مسلمان جہاد ترک کر دینے کی وجہ سے گناہگار ہونگے - کیونکہ فرض پوری قوم پر ہے -

سعدی چلبی حاشیہ غنیہ میں اسکی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

اَقُول لَا يَنْبَغِي اَنْ يَفْهَم مِنْهُ
اَنْ الرُّجُوبَ عَلَى جَمِيعِ
اَهْلِ الْاَرْضِ كَافَّةً حَتَّى
يَسْقُطَ عَنْ اَهْلِ الْهِنْدِ بَقِيَّامِ
اَهْلِ الرُّومِ ' اِنْ لَا يَنْدُ نَعِ
بَقِيَّامِهِمُ الشَّرَّ عَنْ الْهِنْدِ
الْمُسْلِمِينَ - رَاى قَوْلَهُ
تَعَالَى قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ
مِنْ الْكُفَّارِ يَدُلُّ عَلَى اَنْ
الرُّجُوبَ عَلَى اَهْلِ كُلِّ قَطْرٍ
يَقْرُبُوْنَ الْكُفَّارِ - (مَجْمُوعَةُ
فَتْحِ الْقَدِيرِ - ۴ : ۲۸۰)
پس مطلب یہ ہے کہ ہر ملک کے مسلمانوں
پر فرض کفایہ ہے - اگر اس ملک کے تمام مسلمانوں میں سے ایک جماعت یہ
فرض انجام دیتی رہی ، تو رہانکے بقیہ مسلمانوں پر سے ساقط ہو گیا - لیکن
دوسرے ملکوں کے مسلمانوں پر فرضیت باقی رہی - قرآن میں ہے :
قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِنَ الْكُفَّارِ - اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ اُن
مسلمانوں پر جو دشمنوں سے قریب ہوں ، قتال واجب ہے - انتہی -

اور فتح الباری میں ہے ” ہر فرض کفایۃ علی المشہور “ الا ان تدعو
الحاجة الیہ “ اسکے بعد کہا ” و ان جنس جہاد الکفار متعین علی کل
مسلم “ اِما بیدہ و اِما بلسانہ و اِما بقلبہ “ [جلد ۶ : ۲۸] یعنی
جہاد کی یہ قسم فرض کفایہ ہے - باقی رہا نفس جہاد ، تورہ ہر مسلمان
پر فرض ہے ، کسی کیلئے ہاتھ سے ، کسی کیلئے مال سے ، کسی کیلئے
دل سے -

یہ صورت تو اُس قتال کی ہے جسکی صورت حملہ و ہجوم کی ہوگی ،
اگرچہ مقصد اسکا بھی دفاع ہی ہے - دوسری قسم ” دفاع “ ہے - یعنی جب
کرنٹی غیر مسلم حکومت یا جماعت مسلمانوں کی آبادیوں اور حکومتوں پر
حملہ کا قصد کرے ، تو اُس حملہ و تسلط کو ہر طرح مقابلہ کر کے رکنا ، اور
اسلامی ملکوں اور آبادیوں کو غیر مسلموں کی حکومت اور ہر طرح کے
قبضہ و اثر سے محفوظ رکھنا ۔

یہ فرض کفایہ نہیں ہے ، بلکہ بالاتفاق مثل نماز روزہ کے ہر مسلمان پر فرض عین ہے ۔ ایک گروہ کے دفاع کرنے سے باقی مسلمان بری الذمہ نہیں ہو جاسکتے ۔ جس طرح ایک گروہ کے نماز پڑھ لینے سے باقی مسلمانوں کے ذمہ نماز ساقط نہیں ہو جاتی ۔ اسی ہدایہ میں ہے ۔ ” الا ان یکن النفییر عاماً فحینئذ ینصیر من فرض الاعیان ” نفیر ” نفر ” سے ہے ۔ ” نفر ” کے معنی ہیں تیزی کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ درجہ جانا ۔ پس قوم کے ایسے ہزارے اور اجتماع پر جو لڑائی کیلئے ہو ” نفیر ” کا اطلاق ہوا ۔ قرآن میں ہے ۔ انفراراً خفافاً وثقالاً ۔ اور الاتنفروا ۔ مطلب یہ ہے کہ اگر حفظ و دفاع کی ضرورت سے عام اجتماع و قیام کا وقت آ گیا ، تو پھر جنگ کرنا ہر مسلمان پر فرض عین ہو جاتا ہے ۔ ابن ہمام اس کی شرح میں لکھتے ہیں :

هذا اذا لم یکن النفییر عاماً ، فرض کفایہ کی صورت اس وقت تک ہے فاذا کان النفییر عاماً بان کہ عام نفیر کی حالت نہ ہو ۔ لیکن اگر ہجموا علی بلدۃ من بلاد مسلمانوں کے شہروں میں سے کسی شہر المسلمین ، فیصیر من نفیر الاعیان سواہ کان فرض الاعیان سواہ کان المستغفر عدلاً او فاسقاً ۔ ہو جائیگا ۔ خواہ جنگ کیلئے دعوت دینے والا عادل ہو یا فاسق ۔ (فتح القدیر - ۴ : ۲۸۰)

(اور علانیہ میں ہے :

ثم الجہاد ینصیر فرض عین ثم الجہاد ینصیر فرض عین عند النفییر العام علی من یقرب من العدو و هو یقدر علیہ ۔ (مجموعہ فتاویٰ القدیر - ۴ : ۲۸۱)

اسی طرح سراجیہ ، در المختار ، شامی وغیرہ تمام کتب فقہ میں ہے ” اذا جاء النفییر انما ینصیر فرض عین علی من یقرب من العدو ” اور ” الجہاد فرض کفایۃ اذا لم یکن النفر عاماً ، فاذا اقام بہ البعض ، یسقط عن الباقین ۔ فاذا صار النفییر عاماً ، فحینئذ ینصیر من فرض الاعیان ” الخ ۔ جملہ ر ہجوم کے دائمی جہاد میں (جب قتال فرض کفایہ ہے) بعض جماعتیں مستثنیٰ ہیں ۔ مثلاً عورتیں اور نوکر ۔ عورتوں کیلئے

شہر کی خدمت اور چاکر کیلئے آقا کی خدمت مقدم ہے - لیکن اگر دفاع کی ضرورت پیش آگئی ہو تو اسکی فرضیۃ ایسی ہمہ گیر اور بالا تر ہے کہ بچوں اور معذوروں کے سوا کوئی گزرہ، کوئی فرد، مستثنیٰ نہیں ہو سکتا - بیوی بلا شہر کی اجازت کے نکل کھڑی ہو - غلام بلا آقا کے اذن کے مشغول جہاد ہو جائے - ہدایہ میں ہے :

فان هجم العدو على بلد
وجب على جميع الناس
الدفع، تخرج المرأة بغير اذن
زوجها والعبد بغير اذن
المولى - لانه صار فرض
عين و ملك اليمين ورق
النكاح لا يظهر في حق
فروض الاعيان كما في الصلوة
والصوم - بخلاف ما قبل
النفير لان بغير هما مقنعا
فلا ضرورة الى ابطال حق
المولى والزوج (كتاب
السيار)

لیکن اگر دشمنوں نے کسی شہر پر حملہ کیا، تو پھر تمام لوگوں پر دفاع فرض ہو گیا - بیوی بلا شہر کی اجازت کے اور غلام بلا آقا کے اذن کے دفاع میں حصہ لینگے - اسلیے کہ اب جہاد فرض عین ہو گیا، اور جو فرائض ایسے ہیں، انپر مالکیت اور زنجیۃ کے حقوق موثر نہیں ہو سکتے - جیسے نماز اور روزہ - اگر نماز کا وقت آگیا ہے تو عورت پر نماز فرض ہو گئی - شہر کے اذن پر موقوف نہیں - البتہ نفیر سے پہلے یہ صورت نہ تھی - اسوقت عورتوں اور غلاموں کی شرکت کے بغیر بھی یہ فرض ادا ہو سکتا تھا - پس ضرورت نہ تھی کہ شہر اور آقا کے حقوق باطل کیے جائیں -

ہم نے ہدایہ اور متداول کتب فقہ کی عبارتیں سب سے پہلے اسلیے نقل کیں کہ ان کتابوں کے نام سے ہندوستان کی سرکاری عدالتیں بھی آشنا ہیں - اور ہر انگریز قانون داں جانتا ہے کہ محمّدن لا کیلئے ہندوستانی عدالتوں میں سب سے زیادہ معتبر اور بنیادی کتاب یہی ہے - اسکا انگریزی ترجمہ بھی ہو چکا ہے - پس بآسانی دیکھ لیا جاسکتا ہے کہ فی الحقیقت اسلام کے احکام شرعی یہی ہیں یا نہیں؟ روزہ تمام کتب تفسیر و حدیث میں یہ احکام موجود ہیں - امام بخاری نے باب باندھا ہے ”رجوب النفیر“ یعنی جب حفظ ملت کی ضرورت پیش آجائے

تر قتال کیلئے سب کا اُتھنا کھڑا ہونا واجب ہے - پھر آیۃ انفرأ خفاناً و ثقلاً اور ما لکم اذا قيل لکم انفرأ الخ سے رجوب پر استدلال کیا ہے - اسکے بعد حضرت ابن عباس کی روایت درج کی ہے ”لا هجرة بعد الفتح ولكن جهاد ونية اذا استنفرتم فاستنفرأ“ یعنی وہ جو اراذل اسلام میں ایک

خاص طرح کی ہجرت فرض ہوئی تھی ، تو فتح مکہ کے بعد اسکی ضرورت نہیں رہی ۔ البتہ جہاد اور عزم جہاد قیامت تک باقی ہے ۔ توجب جمع ہونے کیلئے پکارے جاؤ ، جمع ہو جاؤ اور جہاد کرو ۔

فتح الباری میں ہے ” الا ان تدعو الحاجة اليه كان يد هم العود و يتعين على من عينه الامام “ ۔ (جلد ۶ : ۲۸)

اور مرطاً امام مالک میں ہے ” اذا كان الكفار مستقرين ببلاذ هم فالجهد فرض كفاية“ ان اقام به بعضهم سقط الحرج عن الباقيين ، و اذا قصدا بلادنا و استنفر الامام المسلمين ، و جب على الاعيان ” شاه ولي الله اسكي شرح میں لکھتے ہیں ” نزدیک استنفر جہاد فرض على الاعيان مي شود ۔ استنفرارا چوں منتقم كنيم حاصل شود حالتی كه مقتضای استنفر شده است از قصد كفار بلاد مارا ، و قيام حرب درمیان جیوش مسلمین و كافرين ، و عدم كفايه ازان مسلمانان ، و الوجه بدان ماند “ (مسرور جلد ۲ - ۱۲۹)

شاه صاحب کے بیان سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ نفیر کی صورت کیا ہے ؟ تو یہ ضرور نہیں کہ کوئی خاص شخص مسلمانوں کو یہ کہہ پکارے کہ آؤ جہاد کرو ۔ مقصود یہ ہے کہ ایسی حالت پیدا ہو جائے جو مقتضای نفیر ہے ۔ پس جب غیر مسلموں نے اسلامی ملکوں کا قصد کیا تو جہاد فرض ہوگیا اور جب دشمنوں کی طاقت ان ممالک کے مسلمانوں سے زیادہ قری ہو اور انکے شکست کا خوف ہو ، تو یکے بعد دیگرے تمام مسلمانان عالم پر فرض ہو جائیگا ۔ خواہ کوئی پکارے یا نہ پکارے ۔ پکارنے والا نہیں ہے تو یہ مسلمانوں کی بدنظمی و بدحالی ہے ۔ انکا فرض ہوگا کہ داعی کا انتظام کریں ۔ یہی حال تمام فرائض کا ہے ۔ نماز کا جب وقت آجائے تو خواہ مردن کی صدائے ” حي على الصلاة “ سنائی دے یا نہ دے ، وقت کا آ جانا وجوب کیلئے کافی ہے ۔

جب دفاع کا فرض عین ہونا واضح ہوگیا ، تو اب معلوم ہونا چاہیے کہ اس فرض کی انجام دہی کیلئے شریعت نے ایک خاص ترتیب اختیار کی ہے ۔ عقل و حکمت کی بنا پر وہی اس معاملہ کی قدرتی اور صحیح ترتیب ہو سکتی تھی ۔ ضرورت اسکی یہ ہے کہ جب غیر مسلموں نے کسی اسلامی حکومت اور آبادی کا قصد کیا ، تو اس شہر کے تمام مسلمانوں پر یہ مہجرت قصد اداء ، دفاع فرض عین ہوگیا ۔ باقی رہے دیگر ممالک کے

مسلمان، تو اگر زیر جنگ مقامات کے مسلمان دشمن کے مقابلہ کیلئے کافی قوت نہیں رکھتے - دشمن بہت زیادہ قوی ہے - یا رکھتے ہیں اور غفلت و تساہل کرنے لگے ہیں، تو اس حالت میں یکے بعد دیگرے تمام دنیا کے مسلمانوں پر بھی دفاع فرض عین ہو جائیگا - بالکل اسطرح جیسے نماز اور روزہ - مگر صورت اُسکی یوں ہوگی کہ چلے اُن مقامات سے قریب تر مقام کے مسلمانوں پر - پھر اُن سے قریب تر پر - پھر اُن سے قریب تر پر - حتیٰ کہ مغرب و مشرق جنوب و شمال، تمام اکثاف عالم کے مسلمانوں پر فرض ہو جائیگا - اُسوقت سارے فرائض، سارے وظائف، سارے کام، ملتمی کر دینے چاہیئیں - بمجرد اطلاع ہر مسلمان کو اپنی تمام قوتوں اور تمام سامانوں کے ساتھ وقف دفاع ملت و جہاد فی سبیل اللہ ہو جانا چاہیے - اگر ایسا نہ کیا گیا تو سب اللہ کے حضور جوابدہ ہونگے - سب مبتلائے معصیت و فسق ہونگے - ایسی معصیت، ایسا فسق، ایسا عدران، ایسا نفاق، جسکے بعد صرف کفر ہی کا درجہ ہے - اگر قیامت کا آنا حق ہے، اور یہ جہوت نہیں کہ خدا کا رجوع ہے، تو مسلمانان عالم کے پاس اُسوقت کیا جواب ہوگا، جب قیامت کے دن پوچھا جائیگا کہ تم کزورں کی تعداد میں زندہ و سلامت موجود تھے - تمہارے جسموں سے روح کھینچ نہیں لی گئی تھی - تمہاری قوتوں کو سلب نہیں کر لیا گیا تھا - تمہارے کان بہرے نہ تھے - نہ ہاتھ کٹے ہوئے اور پانوں لڑگوئے - پھر تمہیں کیا ہو گیا تھا کہ تمہارے سامنے تمہارے بھائیوں کی گردنوں پر دشمنوں کی تلواریں چل گئیں - رطن سے بے رطن اور گھر سے بے گھر ہو گئے - اسلام کی آبادیاں غیروں کے قبضے و تسلط سے پامال ہو گئیں - پر نہ تو تمہارے دلوں میں جنبش ہوئی، نہ تمہارے قدموں میں حرکت - نہ تمہاری آنکھوں نے ایک آنسو بخشا، نہ تمہارے خزانوں پر سے بخل رزر پرستی کے قفل ٹوٹے؟ تم نے چین اور آرام کے بستر پر پر لیت کر بربادی ملت اور پامالی اسلام کا یہ خونین تماشہ اسطرح دیکھا، جیسے بے درد تماشائی سمندر کے کنارے کھڑے ہو کر دیرتے ہوئے جہازوں اور بہتی ہوئی لاشوں کا نظارہ کرتے ہیں !

ارضیتم بالحیاة الدنیا من الآخرة؟ فما حیاة الدنیا الا قليل !

فتح القدیر میں ہے :

فیجب علی جمیع اہل تلك
البلدة النفر، کذا من یقرب
اگر غیر مسلموں نے حملہ کیا تو پھر اُس
شہر کے تمام باشندوں پر دفاع کیلیں

منہم ان لم یکن باہلہا کفایۃ ، آئہ کہڑا ہونا فرض عین ہرجائیگا - ارراگر
 رکذا من یقرب ممن یقرب ان لم یکن بمن یقرب کفایۃ ، دشمن زیادہ طاقتور ہیں اور مقابلہ
 ار تکاسلوا ، ار عصوا ، ر ہکذا ، کیلیے رھاں کے مسلمان کافی نہیں ، تو
 الی ان یحب علی جمیع جو مسلمان اُنسے قریب ہونگے ، انپر بھی
 اہل الاسلام شرقاً و غرباً - فرض عین ہو جائیگا - ارراگر وہ بھی
 (جلد ۴ - صفحہ ۸۲۰) کافی نہیں ، یا انہوں نے سستی کی ،
 یا دانستہ انکار کیا ، تو پھر اُن لوگوں پر
 جو ان سے قریب ہوں یہ فرض عائد ہوگا -

اسی طرح یکے بعد دیگرے - حتی کہ تمام مسلمانوں پر مشرق میں ہوں یا مغرب
 میں ، دفاع کیلیے آئہ کہڑا ہونا فرض ہرجائیگا - انتہی -

ایسا ہی تمام کتب معتمدہ فقہ میں ہے - عبارتوں کے نقل و ترجمہ
 میں طول ہوگا - ردالمحتار وغیرہ شرح میں ذخیرہ سے نقل کیا ہے ” فامامن
 ررائہم ببعد من العدر ، فہو فرض کفایۃ علیہم حتی یسعہم ترکہ ، اذا لم یحتج
 الیہم بان عجز من کان یقرب من العدر عن المقارمۃ ، اولم یعجزوا عنہا لکنہم
 تکاسلوا ، فانہ یفترض علی من یلیہ فرض کالصلوۃ و الصوم لا یسعہم ترکہ ، ثم
 رثم ، الی ان یفترض علی جمیع اہل الاسلام شرقاً و غرباً “

ارر عنایہ شرح ہدایہ میں ہے ” ثم الجہاد یصیر فرض عین عند الذفیر
 العام علی من یقرب من العدر و ہو یقدر علیہ ، و اما من ورائہم فلا یکن فرضا
 علیہم الا اذا احتجج الیہم ، اما لعجز القریب و اما للتکاسل ، فخیذلذذ یفرض
 علی من یلیہم “ الخ -

ارر شرح مرطا میں ہے ” فان لم تقع الکفایۃ بمن نزل بہم ، یجب علی
 من بعد منہم من المسلمین عونہم “ (جلد ۲ - ۱۲۹)

البتہ یاد رہے کہ یہ دفاع کی عام صورت ہے - لیکن در حالتیں شرعاً ایسی
 بھی ہیں ، جن میں یکے بعد دیگرے اس ترتیب و جوب اور الاقرب فلا قرب
 کی ضرورت باقی نہیں رہتی - تمام مسلمانان عالم کیلیے ایک وقت میں اور
 ایک ہی دفعہ دفاع ضروری ہوجاتا ہے - پہلی حالت یہ ہے کہ خلیفہ وقت
 تمام مسلمانان عالم سے طالب اعانت ہو یا اُسکی بے بسی و بے چارگی کی
 ایسی حالت ہوجائے کہ بلا مسلمانان عالم کی مجموعی اعانت کے مخلصی
 ممکن نہ ہو - دوسری صورت یہ ہے کہ اسلام کے عین مرکزی مقام پر غیر مسلم

قابض ہونا چاہیں جنکو ہمیشہ غیر مسلم اثر سے محفوظ رکھنا ہر مسلمان کا فرض ہے خواہ وہ دنیا کے کسی حصہ میں ہو۔ یعنی جزیرہ عرب - تفصیل اسکی آگے آتی ہے۔

(جزیرہ عرب و بلاد مقدسہ)

کوئی قوم زندہ نہیں رہسکتی، جب تک اسکا کوئی ارضی مرکز نہ ہو۔ کوئی تعلیم باقی نہیں رہسکتی، جب تک اسکی ایک زندہ و قائم درسگاہ نہ ہو۔ کوئی دریا جاری نہیں رہسکتا، جب تک ایک محفوظ سرچشمہ سے اسکا لگاؤ نہ ہو۔

نظام شمسی کا ہر ستارہ روشنی اور حرارت صرف اپنے مرکز شمسی ہی سے حاصل کرتا ہے۔ اسی کی بالآخر جاذبہ ہے جو یہ پورا معلق کارخانہ سنبھالے ہوئے ہے ! اللہ الذی رفع السموات بغیر عمد ترنہا، ثم استوی علی العرش، و سخر الشمس والقمر، کل یجری لاجل مسمى ! (۱۳ : ۲)

یہی قانون الہی ہے جسپر اسکی شریعت کے تمام جماعتی احکام مبنی ہیں۔ پس جس طرح اسلام نے امت کے بقا اور حق و ہدایت کے قیام کیلئے ہر طرح کے مرکز قرار دیے، ضرور تھا کہ ایک ارضی مرکز بھی قیامت تک کیلئے قرار دیدیا جاتا۔ ان بے شمار مصلحتوں اور حکمتوں کی بنا پر جنکی تشریح کا یہ موقعہ نہیں، اسلام نے اس غرض سے سرزمین حجاز کو منتخب کیا۔ یہی ناف زمین دنیا کی آخری اور دائمی ہدایت و سعادت کیلئے مرکزی سرچشمہ اور روحانی درسگاہ قرار پائی۔ اور چونکہ سرزمین حجاز جزیرہ عرب میں واقع تھی، رہی اسلام کا اولین موطن، رہی اسکا سب سے پہلا سرچشمہ تھا، اسلئے ضرور تھا کہ اسلامی مرکز کے قریبی گرد و پیش کا بھی حکم ہوتا جو اصل مرکز کا۔ لہذا یہ تمام سرزمین بھی کہ حجاز کی ”راندی غیر ذی زرع“ کو گھیرے ہوئے ہے، اسی حکم میں

داخل ہوگئی۔ ذلک تقدیر العزیز العظیم !

”مرکز ارضی“ سے مقصود یہ ہے کہ اسلام کی دعوت ایک عالمگیر اور دنیا کی بین الملی دعوت تھی۔ وہ کسی خاص ملک اور قوم میں محدود نہ تھی۔ مسلمانوں کی قومیت کے اجزاء تمام کرۂ ارضی میں بکھر جائے اور پھیل جانے والے تھے۔ پس ان بکھرے ہوئے اجزاء کو ایک دائمی متحدہ قومیت کی ترکیب میں قائم رکھنے کیلئے ضروری تھا کہ کوئی ایک مقام

یسا مخصوص گردیا جاتا، جہاں تمام متفرق و منتشر اجزاء کیلئے اتحاد و انضمام کا مرکزی نقطہ ہوتا۔ سارے بکھرے ہوئے اجزاء وہاں پہنچ کر سمیت جاتے۔ تمام پہیلی ہرٹی شاخیں وہاں اکٹھی ہو کر جڑ جاتیں۔ ہر شاخ کو اُس جڑ سے زندگی ملتی، ہر نہر اُس سرچشمہ سے سیراب ہوتی۔ ہر ستارہ اُس سورج سے روشنی اور گرمی لیتا۔ ہر درمی اُس سے قرب پاتی۔ ہر فصل کو اُس سے مواصلت ملتی۔ ہر انتشار کو اُس سے اتحاد و یگانگی حاصل ہوتی۔ رہی مقام تمام اُمت کی تعلیم و ہدایت کیلئے ایک وسطی درسگاہ کا کام دیتا۔ وہی تمام کرۂ ارضی کی پہیلی ہرٹی کثرت کیلئے نقطۂ وحدت ہوتا۔ ساری دنیا تہذیبی پڑ جاتی، پر اُسکا تذکرہ بھی نہ بھٹتا۔ ساری دنیا تاریک ہو جاتی، مگر اُسکی روشنی کبھی نہ بجھتی۔ اگر تمام دنیا اولاد آدم کے باہمی جنگ و جدل اور فتنۂ و فساد سے خون ریزی کی درخ بن جاتی، پھر بھی ایک گوشہ ایسا ہوتا جو ہمیشہ امن و رحمت کا بہشت ہوتا، اور انسانی فتنۂ و فساد کی وہاں پر چھائیں بھی نہ پڑ سکتی۔ اُسکا ایک ایک چپہ مقدس، اُسکا ایک ایک کونہ خدا کے نام پر محترم، اور اُسکا ایک ایک ذرہ اسکے جلال و قدوسیت کا جلوہ گاہ ہوتا۔ خونریز اور سرکش انسان ہر مقام کو اپنے ظلم و فساد کی نجاست سے آلودہ کر سکتا، پر اُسکی فضاء مقدس ہمیشہ پاک و محفوظ رہتی، اور جب زمین کے ہر گوشے میں انسانی سرکشی اپنی مجرمانہ خداندی کا اعلان کرتی تو وہ خدا کی سچی پادشاہت کا تخت گاہ ہوتی۔ دنیا پر کفر و شرک کے جماؤ اور اُٹھان کا کیسا ہی سخت اور برا وقت آجانا، مگر سچی توحید اور بے میل خدا پرستی کا رہ ایک ایسا گھر ہوتا، جہاں خدا اور اُسکی صداقت کے سوا نہ کسی خیال کی پہنچ ہوتی، نہ کسی صدا کی گونج اُٹھ سکتی۔ وہ انسان کی پہیلی ہرٹی نسل کیلئے ایک مشترک اور عالمگیر گھر ہوتا کہ کت کت کر قومیں وہاں جڑیں، اور بکھر بکھر کے نسلیں وہاں سمٹیں۔ پزند جس طرح اپنے اُشیانوں کی طرف اڑتے ہیں، اور پروانوں کو تم نے دیکھا کہ روشنی کی طرف دڑتے، تھیک اُسی طرح انسانوں کے گردہ اور قوموں کے قافلے اُسکی طرف دڑتے، اور زمین کی خشکی و تری کی وہ ساری راہیں جو اُس تک پہنچتیں، ہمیشہ مسافروں اور قافلوں سے بھر رہی رہتیں۔ دنیا بھر کے زخمی دل وہاں پہنچتے اور شفا اور تندرستی کا مرہم پاتے، اور بیدار و مضطرب روحوں کیلئے اُسکے آغوش گرم میں آرام و سکون کی تہذک ہوتی۔

گناہ گئی کٹافلوں سے آلودہ جسم جب وہاں لائے جائے ، اور معر و می
و نا مرادی کی مایوسیوں سے گھائل دل جب چیختے اور تڑپتے ہوئے آسکی
جانب دورے ، تو اسکی پاک ہوا امید و مراد کی عطر بیزی سے مشکبار
ہو جاتی ، اسکے پہاڑوں کی چوٹیاں خدا کی محبت و بخشش کے بادلوں
میں چھپ جائیں ، اور آسکی مقدس فضاء میں رحمت کے فرشتے غول در
غول اتر کر اپنی معصوم مسکراہٹ اور اپنے پاک نغموں کے ساتھ مغفرت
و قبولت کی بشارتیں بانٹتے !

شاخوں کی شادابی جز پر موقوف ہے - درختوں کی جزا اگر سلامت ہے
تو شاخوں اور پتوں کے مرجھا جانے سے باغ اجڑ نہیں سکتا - دس تہذیبیں
کات دی جائیں گی ، تو بیس نئی نکل آئیں گی - اسطرح قوم کا مرکز اگر
محفوظ ہے ، تو اسکے بکھرے ہوئے ٹکروں کی بربادی سے قوم نہیں مت
جاسکتی - سارے ٹکرے مت جائیں ، مگر مرکز باقی ہے تو پھر نئی نئی
شاخیں پھوٹیں گی اور نئی نئی زندگیاں پھیلیں گی - پس جس طرح
مسلمانوں کے اجتماعی دائرہ کیلیے خلیفہ و امام کے رجوع کو مرکز ٹھہرایا ،
اسی طرح آنکی ارضی وسعت و انتشار کیلیے عبادت گاہ ابراہیمی کا کعبہ اللہ
اسکی سر زمین حجاز ، اور اسکا ملک جزیرہ عرب مرکز قرار پایا - یہی معنی
ان آیات کریمہ کے ہیں کہ :

جعل اللہ الکعبۃ اللہ نے کعبہ کو کہ اسکا محترم گھر ہے ، لوگوں
البيت الحرام قیاماً کے بقاؤ قیام کا باعث ٹھہرایا -
للناس (۱۰۰ : ۵)

اور

و اذ جعلنا البيت مثابة اور جب ایسا ہوا کہ ہم نے خانہ کعبہ کو انسانوں
للناس و امنا (۱۲۵ : ۲) کیلیے اجتماع کا مرکز اور امن کا گھر بنایا -

اور

من دخلہ کان امناً جو اسکے حدود کے اندر پہنچ گیا تو اسکے لیے
(۹۷ : ۳) پھر کسی طرح کا خوف اور قدر نہیں -

اور یہی علت تھی تحویل قبلہ کی - نہ رہ جو لوگوں نے سمجھی :

و حیث ما کنتم فاولا اور تم کہیں بھی ہو ، لیکن چاہیے کہ اپنا رخ
رجعکم شطرہ (۲ : ۱۵۰) اسی کی جانب رکھو !

کیونکہ جب یہی ارضی مرکز قرار پایا ، تو تمام افراد قوم کیلیے لازمی ہوا کہ جہاں کہیں بھی ہوں ، رخ اُنکا اسی طرف رہے ۔ دن میں پانچ مرتبہ اپنے قومی مرکز کے طرف متوجہ ہوئے رہیں ۔ اور من جملہ بے شمار مصالح و حکم کے ، ایک قومی تہذیب و حکمت فریضہ حج میں یہی ہے کہ ساری امت تمام کرۂ ارضی ، اور تمام اقوام عالم کو ، حج فرض کر کے اس نقطہ مرکز سے دائمی پیوستگی بخشدی :

و اذن فی الناس بالحج اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دو ۔ پھر ایسا
یا ترک رجالا و علی کل ہوگا کہ ساری دنیا کو یہ گوشہٴ برکت کہینچ
ضامریاتین من کل فج بلاگا ۔ درر دور سے لوگوں کے پبادے اور سوار
عمیق (۲۲ : ۲۸) قافلے اور گرہ پہنچیں گے !

(احکام شرعیہ)

اس مرکز کے قیام و بقاء کیلیے سب سے پہلی بات یہ تھی کہ ہمیشہ کیلیے اسکو صرف اسلام کیلیے مخصوص کر دیا جائے ۔ جب تک یہ خصوصیت قائم نہ کی جاتی ، امت کیلیے اس مرکزیت کے مطلوبہ مصالح حاصل نہیں ہو سکتے تھے ۔

چنانچہ اسی بنا پر مسلمانوں کو حکام دیا گیا کہ انما المشركون نجس فلا یقرروا المسجد الحرام بعد عامہم هذا ۔ مسجد حرام کے حدود صرف توحید کی پاکی کیلیے مخصوص ہیں ۔ اب آئندہ کوئی غیر مسلم ۔ اس کے قریب بھی نہ آئے پائے ۔ یعنی نہ صرف یہ کہ وہاں غیر مسلم نہ رہیں ، بلکہ کسی حال میں داخل بھی نہ ہوں ۔ جمہور اہل اسلام نے اتفاق کیا کہ مسجد حرام سے مقصود صرف احاطہٴ کعبہ ہی نہیں ہے ، بلکہ تمام سرزمین حرم ہے ۔ اور اسی طرح احادیث صحیحہ و کثیرہ سے جو حضرة علی ، سعد بن وقاص ، انس ، جابر ، ابو ہریرہ ، عبد اللہ بن زید ، رافع بن خدیج ، سہل بن حنیف ، وغیرہم اجلۃ صحابہ سے سرری ہیں ، ثابت ہو چکا ہے کہ مدینہ کی زمین بھی مثل مکہ کے حرم ہے اور غیر و ثور اس کے حدود ہیں ۔ ” المدینۃ حرام ما یسن عیبر الی ثور “ اخرجہ الشیخان ۔ اور روایت سعد کہ ” انی اعلم ما یسن لابتی المدینہ ان یقطع اعضا ہا

ار یقتل صیدھا ” رواہ مسلم - اور ریت انس متفق علیہ کہ ” اللہم ان ابراہیم حرم مکہ ، رانی احرم ما بین لا بتیہا “ (۱)

یہ احکام تو خاص اس مرکز کی نسبت تھے - باقی رہا اسکا گرد و پیش ، یعنی جزیرہ عرب ، تو گو اس کے لیے اس قدر اہتمام کی ضرورت نہ تھی کہ اسمیں غیر مسلم کا داخلہ تک رک دیا جائے ، تاہم اسکا خالص اسلامی ملک ہونا ضروری تھا - تاکہ اسلامی مرکز ارض کا گرد و پیش اور اسکا مولد و منشاء ہمیشہ غیروں کے اثر سے یکقلم محفوظ رہے -

اسلام کا جب ظہور ہوا تو علامہ مشرکین عرب کے یہود و نصاریٰ کی بھی ایک بڑی جماعت جزیرہ عرب میں آباد تھی - مدینہ میں یہودیوں کے متعدد قبیلے تھے - خیبر میں انہی کی ریاست تھی - یمن میں نجران عرب عیسائیوں کا بڑا مرکز تھا - مدینہ کی سرزمین خود آپ کی زندگی ہی میں یہودیوں سے خالی ہو گئی - آخری جماعت جو مدینہ سے خارج کی گئی بنو قینقاع اور بنو حارثہ کا گروہ تھا - امام مسلم نے ابن عمر کا قول نقل کیا ہے ” ان یہود بنی النضیر حاربوا رسول اللہ صلعم فاجلی بنی النضیر و اقر قریظہ و من علیہم ، حتی حاربت قریظہ فقتل رجالہم و قسم اولادہم و نسائہم بین المسلمین الا بعضهم لحقوا برسول اللہ فامنہم و اسلموا “ و اجلی یہود المدینۃ کلہم بنی قینقاع و ہم قوم عبد اللہ بن سلام و یہود بنی حارثہ و کل یہودی کان بالمدینہ “

بخاری و مسلم میں اس آخری اخراج کا واقعہ ہر رایت حضرت ابو ہریرہ مروی ہے - آپ صحابہ کو ساتھ لیکر یہودیوں کی تعلیم گاہ میں تشریف لیگئے اور فرمایا ” یا معشر الیہود اسلموا تسلموا “ اسلام قبول کرو - نجات پاؤ گے - پھر فرمایا ” اعلموا ان الارض للہ و رسولہ و انی ارید ان اجلیکم من ہذہ الارض فمن رجد منکم بمالہ شیئاً فلیبعہ “ والا ، فاعلموا ان الارض للہ و رسولہ “ میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ تم کو اس ملک سے خارج کر دوں - پس اپنا مال و متاع فروخت کرنا چاہو تو کر دو - ورنہ جان رکھو کہ اس ملک کی حکومت صرف اللہ اور اس کے رسول ہی کیلئے ہے -

(۱) زیادہ مفصل بحث رسالہ جامع الشواہد میں لکھ چکا ہوں - اس رسالہ کا اصل موضوع مسئلہ خلافت ہے - یہ تکرر ضمناً آ گیا ہے - پس اشارات پر اکتفا کیا گیا -

جب آپ دنیا سے تشریف لیگئے تو در مقام ایسے رکھئے تھے جہاں سے یہود و نصارا کا اخراج نہ ہو سکا تھا - خیبر اور نجران - پس آپؐ وصیت فرمائی کہ آئندہ جزیرہ عرب صرف اسلام کیلئے مخصوص کر دیا جائے - جو غیر مسلم اس ملک میں باقی رکھئے ہیں " خارج کر دیے جائیں - امام بخاری نے باب باندھا ہے " اخراج الیہود من جزیرۃ العرب " اسمیں پہلی روایت یہود مدینہ کے اخراج کی لائے ہیں جو ادرگرز چکی - دوسری روایت حضرت ابن عباس کی ہے کہ آنحضرتؐ صلعم نے مرض الموت میں تین باتوں کی وصیت فرمائی تھی - ایک یہ تھی " اخرجوا المشرکین من جزیرۃ العرب " حافظ ابن حجر لکھتے ہیں " اقتصر علی ذکر الیہود لانہم یوحذرون اللہ تعالیٰ الا القلیل ومع ذلک امر باخراجہم " فیکون اخراج غیرہم من الکفار بطریق اولی " (فتح الباری - ۶ : ۱۹۳) یعنی امام بخاری نے عنوان باب میں صرف یہود کا ذکر کیا - اسمیں استدلال یہ ہے کہ تمام غیر مسلم اقوام میں یہودی سب سے زیادہ توحید کے قائل ہیں - انکو خارج کیا گیا تو دیگر مذاہب کے اخراج کا وجوب بدرجہ اولیٰ ثابت ہو گیا - حضرت عمر کی روایت میں " یہود و نصاریٰ " کا لفظ ہے " لاخر جن الیہود و النصاری من جزیرۃ العرب حتی لا ادع الا مسلما " راہ مسلم و احمد و الترمذی و صحیحہ - ابو عبیدہ بن جراح سے امام احمد نے روایت کیا ہے " اخر ما تکلم بہ رسول اللہ صلعم اخرجوا یہود اهل الحجاز و اهل نجران من جزیرۃ العرب " حضرت عائشہ کی روایت میں اسکی علت بھی واضح کر دی ہے " آخر ما عهد رسول اللہ صلعم ان قال لا یترک بجزیرۃ العرب دنیاں " راہ احمد - یعنی سب سے آخری وصیت رسول اللہ کی یہ تھی کہ جزیرہ عرب میں در دین جمع نہ ہوں - یعنی صرف اسلام کیلئے مخصوص ہو جائے - امام مالک نے موطا میں عمر بن عبد العزیز اور ابن شہاب کے مراسیل نقل کیے ہیں اور مصمودی و غیرہم نے باب باندھا ہے " اخراج الیہود و النصاری من جزیرۃ العرب " عمر ابن عبد العزیز کی روایت میں ہے " کان من آخر تکلم بہ رسول اللہ صلعم انہ قال قاتل اللہ الیہود و النصاری " اتخذوا قبور انبیائہم مساجد - لا یبقیان دنیاں بارض العرب " اور ابن شہاب کا لفظ ہے " لا یجتمع دنیاں فی جزیرۃ العرب " حضرت عمر ابن عبد العزیز نے آخر تکلم " قاتل اللہ الیہود و النصاری " جو نقل کیا ہے " تو حضرت عائشہ سے صحیحین وغیرہا میں بطریق رفع بھی ثابت ہے - حافظ نواری نے گوامام بخاری کا اتباع کیا اور " اجلاء الیہود "

کا باب استدلالاً کافی سمجھا، لیکن حافظ مذہبی نے تلخیص مسلم میں ”اخراج الیہود والنصارى من جزيرة العرب“ کا الگ باب باندھ کر جزیرہ عرب والی روایتیں روایات اجلہ یہود سے الگ کر دی ہیں۔ یہ وصیت نبوی علاوہ طارق بالا کے مسند امام احمد، مسند حمیدی، آرسنن بیہقی وغیرہ میں بھی مختلف طریقوں سے مرئی ہے، اور سب کا مضمون متحد اور باہم ذکر اجمال و تبیین اور اعتضاد و تقویت کا حکم رکھتا ہے۔

احکام شرعیہ دو قسم کے ہیں۔ ایک قسم اُن احکام کی ہے جنکا تعلق افراد کی اصلاح و تزکیہ سے ہوتا ہے۔ جیسے تمام ادا امر و نہی اور فرائض و واجبات۔ دوسرے وہ ہیں جنکا تعلق افراد سے نہیں بلکہ امت کے قومی اور اجتماعی فرائض اور ملکی سیاسیات سے ہوتا ہے۔ جیسے فتح ممالک و قوانین سیاسیت و ملکیت۔ سنۃ الہی یوں واقع ہوئی ہے کہ پہلی قسم کے احکام خود شارع کی زندگی ہی میں بتدریج تکمیل تک پہنچ جاتے ہیں، اور وہ دنیا نہیں چھوڑتا مگر اُنکی تکمیل کا اعلان کرے۔ لیکن دوسری قسم کیلئے ایسا ہونا ضروری نہیں۔ بسا احکام ایسے ہوتے ہیں جنکے نفاذ و وقوع کیلئے ایک خاص وقت مطلوب ہوتا ہے اور وہ شارع کے بعد بتدریج تکمیل و تنفیذ تک پہنچتے ہیں۔ پس اُنکی نسبت یا تو بطریق پیشین گوئی کے خبر دیدی جاتی ہے۔ یا اپنے جا نشینوں اور امت کو وصیت کر دی جاتی ہے۔

یہ معاملہ اسی دوسری قسم میں داخل تھا۔ پس ضرور نہ تھا کہ اسکا پورا پورا نفاذ خود آنحضرت صلعم کی حیات طیبہ ہی میں ہو جاتا۔ آپ نے یہود مدینہ کے اخراج سے نفاذ شروع کر دیا۔ یہود خیبر سے ابتدا ہی میں شرط کر لی تھی کہ جب ضرورت ہوگی، اس سر زمین سے خارج کر دیے جاؤ گے۔ پھر تکمیل کیلئے اپنے جا نشینوں کو وصیت فرمادی۔ چنانچہ حضرت عمر (رض) کے زمانے میں تکمیل کا وقت آ گیا۔ اور یہود خیبر نے طرح طرح کی شرارتیں اور نافرمانیاں کر کے خود ہی اسکا موقعہ بہم پہنچا دیا۔ پس حضرت عمر نے اس وصیت کی تحقیق کی، اور جب پوری طرح تصدیق ہو گئی تو تمام صحابہ کو جمع کر کے اعلان کر دیا۔ سب نے اتفاق کیا، اور یہود خیبر و فدک خارج کر دیے گئے۔ اسی طرح نجران سے عیسائیوں کا اخراج بھی عمل میں آیا۔ امام زہری نے ابن عتبہ سے اور امام مالک نے ابن شہاب سے روایت کیا ہے ”ما زال عمر حتی رجد الثبت عن رسول الله انه قال لا یجتمع بجزيرة العرب دینان“ فقال من کان

لہ من اهل الكتابین عهد فلیات بہ ، انفذ لہ ، والا فانہی مجلیکم ، فاجلا ہم “ (اخرجه ابن ابی شیبہ) امام بخاری نے یہود خیبر کے اخراج کا واقعہ کتاب الشروط کے باب ” اذا اشترط فی المزارعة اذا شئت اخرجتک “ میں درج کیا ہے ، اور ترجمہ باب میں استدلال ہے کہ یہود خیبر کا تقرر پہلے ہی سے عارضی و مشروط تھا - بالاستقلال نہ تھا - حافظ عسقلانی لکھتے ہیں کہ حضرت عمر کے اجلاء کردہ اہل کتاب کی تعداد چالیس ہزار منقول ہے - (۱)

پس صاحب شریعت کے قول و عمل ، انکے آخرین لمحات حیات کی رمینٹ ، حضرت عمر کے فحص و تصدیق ، تمام صحابہ کے اجماع و اتفاق سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ اسلام نے ہمیشہ کیلئے جزیرہ عرب کو صرف اسلامی آبادی ہی کیلئے مخصوص کر دیا ہے - الا یہ کہ کسی مصلحت سے خلیفہ وقت عارضی طور پر کسی گروہ کو داخل ہونے کی اجازت دیدے - اور ظاہر ہے کہ جب غیر مسلموں کا قیام اور در دینوں کا اجتماع وہاں شریعت کو منظور نہیں ، تو غیر مسلم کی حکومت یا حاکمانہ فرائی و بالا دستی کو جائز رکھنا کب شرعاً مسلمانوں کیلئے جائز ہو سکتا ہے ؟

(جزیرہ عرب کی تحدید)

باقی رہا یہ مسئلہ کہ جزیرہ عرب سے مقصود کیا ہے ؟ تو یہ بالکل صاف و واضح ہے - اسکے لیے کسی بحث و نظر کی ضرورت ہی نہیں - نص حدیث میں ” جزیرہ عرب “ کا لفظ وارد ہے - اور عقلاً و اصولاً ظاہر ہے کہ جب تک کوئی سبب قوی موجود نہ ہو ، کسی لفظ کے منطوق اور عام و متعارف مدلول سے انحراف جائز نہ ہوگا - اور نہ بلا مخصص کے قیاساً تخصیص جائز - شارع نے ” جزیرہ “ کا لفظ کہا ، اور دنیا میں آسروقت سے لیکر اب تک جزیرہ عرب کا اطلاق ایک خاص ملک پر ہر انسان کر رہا اور جان

(۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخیری وصایا شمار کیے گئے تو مختلف روایات میں سات کلمات ملے - انکے زامی کہتے ہیں کہ یہ منجزملہ آخر ما تکلم بہ کے ہیں - پھر ان کے فقہ و اسرار پر غور کیا گیا تو معلوم ہوا کہ فی الحقیقت وہی کلمات خاتم النبیین کی حیات طیبہ کے اخیری ارشادات ہو سکتے تھے - اس فصل کے لکھتے ہوئے طبیعت بے اختیار اُس طرف مائل ہوگئی اور رسالہ کی تحریر ملتوی کر کے انکی شرح لکھنی شروع کر دی - اور در دن میں ختم ہوئی - فالحمد لله علی ذلک -

رہا ہے - پس جو مطالب اسکا سمجھا جاتا تھا اور سمجھا جاتا ہے " وہی سمجھا جایگا - تمام مورخین و جغرافیہ نگاران قدیم و جدید متفق ہیں کہ عرب کو "جزیرہ" اسلیے کہا گیا کہ تین طرف بحر ہند، خلیج فارس، اور دریائے پانی سے محصور ہے - یعنی تین طرف بحر ہند، خلیج فارس، اور بحر احمر و قلزم واقع ہیں، اور ایک جانب دریائے دجلہ و فرات - فتح الباری وغیرہ میں ہے "قال الخلیل سمیت جزیرۃ العرب لان بحر فارس و بحر الحبشہ و الفرات و الدجلہ احاطت بها" (۱۱۸: ۶) اور اسمعی کا قول ہے "لاحاطۃ البحار بها" یعنی بحر الہند و القلزم و بحر فارس و بحر الحبشہ و دجلۃ (ایضاً) اور نہایہ میں امام زہری کا قول نقل کیا ہے "سمیت جزیرۃ لان بحر الفارس و بحر السودان احاط بجانبيها" و احاط بالجانب الشمالي دجلۃ و الفرات "یہی قول ارباب لغۃ کا ہے - قاموس میں ہے "جزیرۃ العرب ما احاط به بحر الہند و الشام ثم دجلہ و الفرات" پروفیسر پطرس بستانی نے (جو زمانہ حال میں شام کا ایک مشہور مسیحی مصنف گزرا ہے اور جس نے عربی میں انسائیکلو پیڈیا لکھنی شروع کی تھی) محیط المحيط میں جزیرۃ عرب کی یہی تعریف کی ہے - حاصل سب کا یہی ہے کہ جزیرۃ عرب وہ سرزمین ہے جسکے تین جانب سمندر ہیں اور شمالی جانب دریائے دجلہ و فرات -

سب سے زیادہ مفصل جغرافیہ یاقوت حمیری نے معجم البلدان میں دیا ہے جس سے زیادہ جامع و معتبر کتاب عربی میں جغرافیہ و تقویم بلدان کی کوئی نہیں - اور اسکو ہر روایت ابو المنذر حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے - "قال انما سمیت بلاد العرب جزیرۃ لاحاطۃ الانهار بالبحار" و ذلک ان الفرات اقبل من بلاد الررم، فظهر بناحیۃ قنسرین، ثم انحط علی أطراف الجزیرہ و سواد العراق، حتی وقع فی البحر فی ناحیۃ البصرۃ و الابلہ، و امتد الی عبادان، و اخذ البحر فی ذلک الموضع مغرباً منعطفاً ببلاہ العرب" الخ - خلاصہ اس کا یہ ہے کہ عرب اسلیے جزیرہ مشہور ہوا کہ سمندروں اور دریاؤں سے وہ گھرا ہوا ہے - صورت اسکی یوں ہے کہ دریائے فرات بلاد ررم سے شروع ہوا اور قنسرین کے نواح میں عرب کی سرحد پر ظاہر ہوا - پھر عراق میں ہوتا ہوا بصرہ کے پاس سمندر میں جا ملا - وہاں سے پھر سمندر نے عرب کو گھیرا، اور قطیف و ہجر کے کناروں سے ہوتا ہوا عمان اور شحر سے گزر گیا - پھر حضر موت اور عدن ہوتا ہوا پچھم کی جانب یمن کے ساحلوں سے

جا ٹکرایا۔ حتیٰ کہ جدہ نمودار ہوا جو مکہ و حجاز کا ساحل ہے۔ پھر ساحل طور اور خلیج ایلہ پر جا کر سمندر کی شاخ ختم ہوگئی۔ پھر سرزمین مصر شروع ہوتی ہے، اور قلزم نمودار ہوتا ہے اور اسکا سلسلہ بلاد فلسطین سے سواحل عسقلان ہوتا ہوا سرزمین مصر کا ساحل اردن تک بیررت پر پہنچتا ہے، اور آخر میں پھر قدسین تک منتہی ہوکر رہ جگہ آجاتی ہے جہاں سے فرات نے عرب کا احاطہ شروع کیا تھا۔ پس اس طرح چاروں طرف پانی کا سلسلہ قائم ہے۔ بھر احمر اور قلزم کی درمیانی خشکی بھی پانی سے خالی نہیں۔ کیونکہ سرقان سے دریائے نیل وہاں آ پہنچتا ہے اور قلزم میں گرتا ہے۔ یہی جزیرہ ہے جس سے عرب کی سرزمین عبارت ہے اور یہی عرب اقوام کا مولد و منشاء ہے، انتہی ملحظاً۔ (جلد ۳ - ۱۰۰)

اس تفصیل سے بالکل واضح ہوگیا کہ جزیرہ عرب کے حدود کیا ہیں؟ عرب کا نقشہ اپنے سامنے رکھو اور اس پر مندرجہ بالا تخطیط منطبق کر کے دیکھو۔ اوپر شمال ہے۔ دھنے مشرق اور بائیں مغرب۔ شمال میں دریائے فرات مغرب سے خم کھاتا ہوا نمودار ہوتا ہے اور صحرائے شام کے کنارے سے گزرتا ہوا نجلہ سے ملجاتا ہے۔ پھر دونوں ملکر خلیج فارس میں گرتے ہیں۔ فرات کے پیچھے نجلہ کا خط ہے اور اسی پر بغداد واقع ہے۔ خلیج فارس کے مشرق میں ایران ہے اور مغربی ساحل میں قطیف و احساء۔ پھر یہ خلیج تنگ نائے هرمز سے نکلکر مسقط و عمان کے کناروں سے گزرتا ہے اور اسکے بعد ہی بھر عمان نمودار ہو جاتا ہے۔ اسکے بعد حضرموت کا ساحل دیکھو گے۔ پھر عدن آگیا، اور باب المندب سے جونہی آگے بڑھے، بھر احمر شروع ہوگیا۔ چونکہ اسکا مغربی ساحل افریقہ و حبش سے متصل ہے، اسلیے قدیم جغرافیہ میں اسکو بھر حبش بھی کہتے تھے۔ بھر احمر کے کنارے پہلے یمن اور پھر جدہ ملیگا۔ اسکے بعد ساحل حجاز۔ حتیٰ کہ سمندر کی شاخ پتلی ہوکر طور سینا تک منتہی ہوگئی، اور اسکے ساتھ ہی خلیج عقبہ کی شاخ نظر آئیگی۔ اب مصر کی سرزمین شروع ہوگئی۔ نہر سوئیس کے بننے سے پہلے یہ خشکی کا ایک ٹکڑہ تھا جس نے بھر احمر کو بھر متوسط سے جدا کر دیا تھا۔ اسلیے صاحب معجم نے یہاں دریائے نیل کا ذکر کیا ہے جو اسی درمیانی تختہ خشک کے بالیں جانب دیکھ رہے ہو۔ قاہرہ سے ہوتا ہوا اسکندریہ کے پاس سمندر سے جا ملا ہے۔ پس اگرچہ اُس زمانے میں یہ ٹکڑہ خشک تھا مگر سمندر کی جگہ دریائے نیل کا خط آبی موجود تھا۔

اسکے بعد بحر متوسط کے ابتدائی حصہ کو قدیم جغرافیہ نویس بحر مصر و شام سے تعبیر کرتے تھے۔ اسی پر بیروت واقع ہے اور ساحل سے اندر کی جانب دیکھو گے تو پھر وہی مقام سامنے ہوگا، جہاں سے دریائے فرات نمودار ہو کر خلیج فارس کی جانب بہتا تھا۔ پس ایک پورا مثلث نما ٹکڑہ ہے جو اس تمام بحری احاطہ کے اندر واقع ہے۔ صرف خشکی کا ایک حصہ شمال میں فرات کے بائیں جانب نظر آتا ہے۔ یعنی شام۔ یہی مثلث ٹکڑہ جزیرہ عرب ہے۔ قدیم و جدید جغرافیہ نگار دونوں اسمیں متفق ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ عرب کے ”جزیرہ“ اور ”جزیرہ نما“ ہونے میں سب سے زیادہ اہم وجود دریائے دجلہ و فرات کا ہے۔ کہونکہ اگر یہ عرب کے حدود سے کوئی متصل تعلق نہیں رکھتے، تو پھر اسکی ایسی صورت ہی باقی نہیں رہتی جس پر جزیرہ کا اطلاق ہو سکے۔ شمال کی جانب بالکل خشک رہ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس کسی نے عرب کی تعریف کی، احاطہ بحر و نہر کا لفظ کھر راضع کر دیا کہ جانب شمال دجلہ تک پھیلا ہوا ہے۔ اور جنہوں نے مقامات کے نام لیکر حدود متعین کیے، انہوں نے صاف کہہ دیا کہ شمالی حد دجلہ ہے۔ نہایت معجم البلدان اور فتح الباری میں اصمعی کا قول منقول ہے ”من اقصى عدن ابین الی ریف العراق طولاً“ و من جدہ و ساحل البحر الی اطراف الشام عرضاً ”کرمانی نے کہا ”ہی ما بین عدن الی ریف العراق طولاً“ و من جدہ الی الشام عرضاً“ یہی قامرس میں ہے۔ ایسا ہی ابن کلیبی سے مرئی ہے۔ رفاعة بک طہطہاری نے قدیم و جدید کتب سے اخذ کر کے عربی میں ”تعريفات النافعة لمربد الجغرافيه“ لکھی۔ اسمیں بھی یہی حدود ہیں۔ پس صاحب معجم کی تفصیل اور تمام اقوال سے ثابت ہوا کہ عرب طول میں عدن سے لیکر عراق کی ترائی تک، اور عرض میں ساحل بحر احمر سے خلیج فارس تک پھیلا ہوا ہے۔ اسکی حد شمال میں دھنی جانب دجلہ ہے، اور بائیں جانب عرض کا خط کھینچیں تو شام۔ آجکل کے جغرافیوں میں بھی عرب کے حدود یہی بتلائے جاتے ہیں کہ پچھم میں بحر احمر، جنوب میں بحر ہند، یورپ میں خلیج فارس، اور دکھن میں ملک شام ہے۔

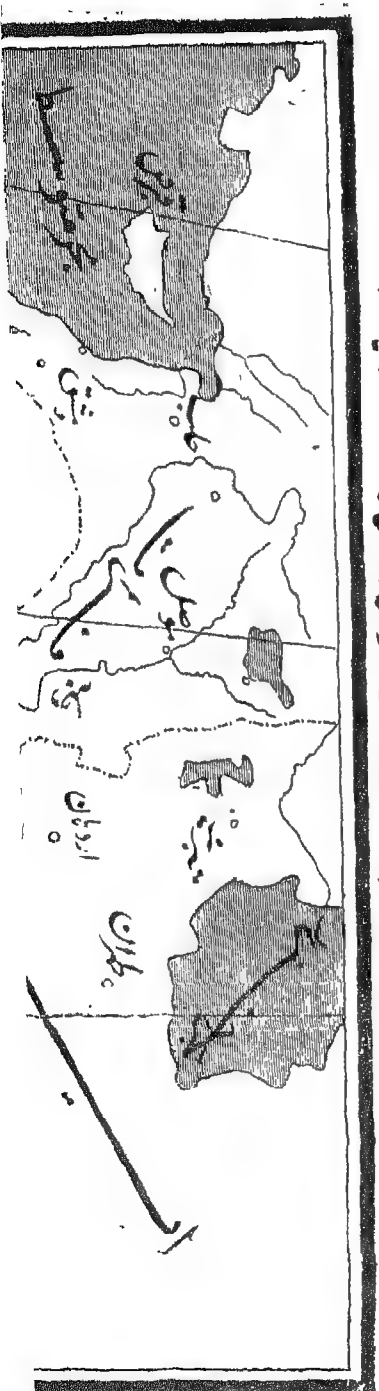
اسی معجم البلدان میں عراق کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے ” ای انہا اسفل ارض العرب “ (جلد ۶ : ۱۳۳) یعنی عراق اسلیے نام ہوا کہ زمین عرب کا سب سے زیادہ نچلا حصہ ہے - اس سے بھی واضح ہو گیا کہ عراق عرب میں داخل ہے - البتہ عراق کا وہ حصہ جو دجلہ کے پار واقع ہے ، اسمیں داخل نہ ہوگا -

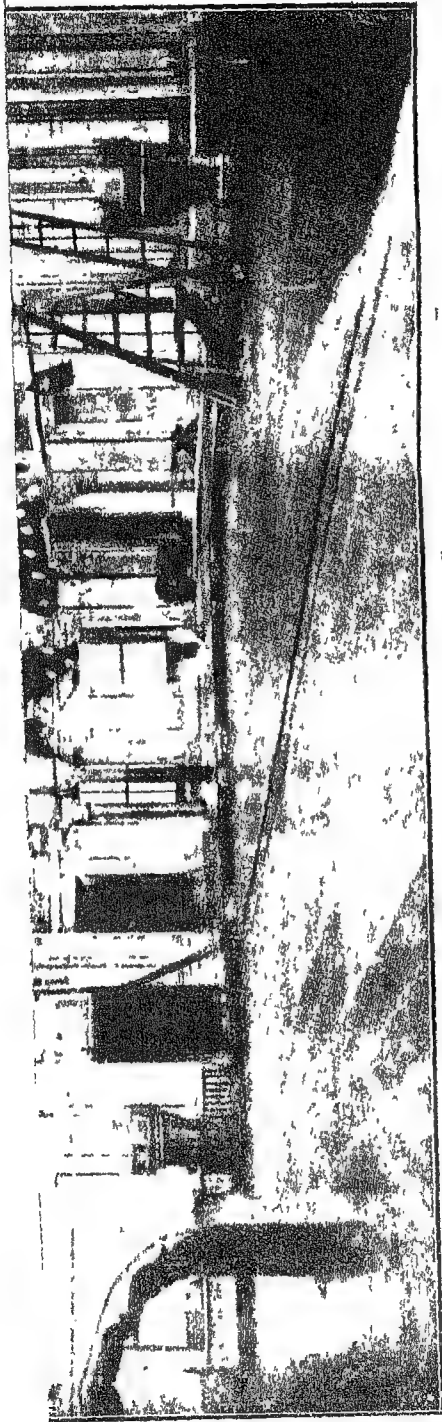
ہم یہاں عرب کا ایک نقشہ تفسیر البیان کے مسودہ سے لیکر درج کرتے ہیں - اس نقشہ میں ظہور اسلام کے وقت جزیرہ عرب کی حالت دکھلائی ہے - یہ نقشہ دراصل یورپ کے بعض مشہور مستشرقین (اورنٹلسٹ) نے قدیم نقشوں اور تعریفات سے مدد لیکر طیار کیا تھا جسکو سنہ ۱۸۵۰ء میں ہرنر فیسر فرڈیننڈ ویسٹن فیلڈ (Ferdinand Wustenfeld) نے لیڈن یونیورسٹی سے شائع کیا - جزیرہ عرب کے تمام قدیم نقشوں میں یہ سب سے زیادہ صحیح اور مستند ہے - نقطوں کے خطوط سے تجارتی قافلوں کی وہ سڑکیں دکھلائی ہیں جو چھٹی صدی عیسوی میں عرب کے اندرونی مقامات سے سواحل تک جاتی تھیں -

(مسجد اقصیٰ و ارض مقدس)

مقامات مقدسہ اسلامیہ کے سلسلہ میں بیت المقدس اور اسکی سر زمین کا مسئلہ مسلمانوں کیلئے اس سے کم اہمیت نہیں رکھتا جسقدر حرم مکہ اور حرم مدینہ - اسلام نے جن تین مقامات کے لیے یہ نیت طاعت و ثواب سفر کرنے کی اجازت دی ہے ، ان میں جس طرح مکہ و مدینہ کا ذکر ہے ، اسی طرح بیت المقدس کا بھی ہے - مسلم و بخاری کی مشہور روایت میں ہے ” لا تشد الرحال الا الى ثلاثة مساجد : المسجد الحرام ، و مسجدی هذا “ والمسجد الاقصیٰ ” یعنی یہ نیت زیارت و طاعت سفر کا قصد و اہتمام نہیں ہے مگر ان تین جگہوں کیلئے - مسجد حرام ، مسجد مدینہ ، اور مسجد اقصیٰ - اس سے معلوم ہوا کہ تمام دنیا میں مسلمانوں کیلئے شرعاً یہی تین مقام سب سے زیادہ مقدس و محترم ہیں - انہی کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ انکی زیارت کیلئے نیت کر کے اپنے رطوں سے نکلتے ہیں ، سفر کی تکلیفیں اور صعوبتیں برداشت کرتے ہیں ، اور یقین کرتے ہیں کہ اسکے معارضہ میں انکے لیے بڑا ہی اجر ہے - اسی بنا پر جمہور ائمہ اسلام کا مذہب ہے کہ مسجد اقصیٰ کی زیارت

اخرجوا اليهود والنصارى من جزيرة العرب (الحديث)





جہر بقیہ یورپینوں فرکی میں اسلام کی آخری متاع عزت ہے ۔
ایڈریا: نوبل کی جامع مسجد

کی اگر نذر مانی ہو، تو اسکا ادا کرنا اسی طرح واجب ہے، جس طرح زیارت مسجد نبوی و حج و عمرہ کا ادا کرنا۔ لیکن ان تین جگہوں کے علاوہ کسی دوسری زیارتگاہ کے سفر کیلئے نذر مانی ہو، تو اسکا ادا کرنا باتفاق ائمہ واجب نہ ہوگا۔ اس سے اندازہ کر لیا جاسکتا ہے کہ بیت المقدس کی سرزمین مسلمانوں کے مذہبی احکام و اعتقاد میں کیا درجہ رکھتی ہے؟ یہی وہ مقدس سرزمین ہے جسکا اللہ نے یہودیوں سے وعدہ کیا تھا، اور بالآخر وعدہ پورا ہو کر رہا۔ لیکن وہ اسکے اہل ثابت نہ ہوئے، اور دنیا کی حکومت و عزت کے ساتھ یہاں کی پادشاہت بھی اُن سے جاتی رہی۔ پھر مسیحی دور شروع ہوا۔ اسکے بعد مسلمان اسکے وارث ہوئے۔ قرآن حکیم نے مسلمانوں کو خصوصیت کے ساتھ اس وراثت کی بشارت دی تھی : و لقد کتبت فی الزبور

من بعد الذکر، ان الارض یرثها عبادي الصالحون - ان فی هذا لبلغاً لقوم عابدین - وما ارسلناک الا رحمة للعالمین (۲۱ : ۱۰۵) حضرت ابن عباس وغیرہ سے مراد ہے کہ اس آیت میں ”الارض“ سے مقصود بیت المقدس اور فلسطین ہے۔ اسمیں خبر دی گئی تھی کہ اب اسکی پادشاہت مسلمانوں کے حصے میں آئیگی۔ اسی لیے کہا : ان فی هذا لبلغاً الخ۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے ہمیشہ اس سر زمین کی خدمت کو اللہ کی طرف سے ایک مخصوص عطیہ و امانت سمجھا، اور اسکی حفاظت کو حرمین کی طرح ساری دنیا کی حکومت و فرماں رواں سے بھی زیادہ عزیز رکھا۔ یہی اعتقاد دینی تھا جس نے مسیحی جہاد کی اُن آگہ لڑائیوں کو کامیاب ہونے نہ دیا جن میں تمام یورپ کی طاقت اکٹھی ہو گئی تھی، حالانکہ وہ وقت مسلمانوں کی پولیٹیکل طاقت کے عروج کا نہیں بلکہ تنزل و انحطاط کا تھا، اور تمام عالم اسلامی مختلف حکومتوں میں متفرق ہو چکا تھا۔ اسوقت سے لیکر آج تک وہاں کی حکومت خلیفۃ اسلام کے ماتحت رہی ہے، اور خود یورپ نے مسیحی مذاہب کے امن و سکون کیلئے اسے بہتر سمجھا ہے۔ پس اگر آج پھر ازمنہ مظلومہ (مڈل ایجز) کی تاریخ دہرائی جائیگی، اور اسلام کی جگہ اُسے مسیحیت یا یہودیت کے زبر اثر لانے کی کوشش کی جائیگی، تو مسلمانوں کیلئے ناممکن ہے کہ گوارا کر سکیں۔ اُنکا فرض ہوگا کہ جب گذشتہ کرر سید کا ایک حصہ دھرایا گیا ہے، تو دوسرا حصہ بھی ظہور میں آجائے۔ یہ مسلمانوں کی دینی زیارت گاہ ہے۔ وہ اُنکا مقدس مقام ہے۔ اسکی

مذہبی وابستگی اُنکے ایمان و مذہب کا جزو ہے ۔ اگر وہاں یہودیوں کا اقتدار بڑھایا جاتا ہے ، یا کسی مسیحی حکومت کو نگرانی و بالا دستی کے نام سے قائم کیا جاتا ہے ، تو یہ مسلمانوں کی جماعت اور آبادیوں ہی کو نہیں بلکہ انکی شریعت کو چیلنج دینا ہے ، اور مسلمانوں کو مجبور کر دینا ہے کہ یا تو اسلام کی جانب سے اس چیلنج کو قبول کر لیں ، یا اسکی اطاعت و حمایت سے دست بردار ہو جائیں ۔

(خاتمہ سخن و نتائج بحث)

گزشتہ مباحث و تفصیلات کا خلاصہ حسب ذیل ہے :

(۱) اسلام کا قانون شرعی یہ ہے کہ ہر زمانے میں مسلمانوں کا ایک خلیفہ و امام ہونا چاہیے ۔ ” خلیفہ “ سے مقصود ایسا خود مختار مسلمان بادشاہ اور صاحب مملکت ہے جو مسلمانوں اور انکی آبادیوں کی حفاظت اور شریعت کے اجراء و نفاذ کی پوری قدرت رکھتا ہو اور دشمنوں کے مقابلے کیلئے پوری طرح طاقتور ہو ۔

(۲) اسکی اطاعت و اعانت ہر مسلمان پر فرض ہے ۔ اور مثل اطاعت خدا و رسول کے ہے ۔ تارقیتیکہ اُس سے کفر بواج (صریح) ظاہر نہو ۔ جو مسلمان اسکی اطاعت سے باہر ہوا ، وہ اسلامی جماعت سے باہر ہو گیا ۔ جس مسلمان نے اُسکے مقابلے میں لڑائی کی ۔ یا لڑنے والوں کی مدد کی ، اُس نے اللہ اور اسکے رسول کے مقابلے میں تلوار کھینچی ۔ وہ جماعت اسلام سے باہر ہو گیا اگرچہ نماز پڑھتا ہو ، روزہ رکھتا ہو ، اور اپنے نکلیں مسلم سمجھتا ہو ۔

(۳) ایک خلیفہ کی حکومت اگر جم چکی ہے ، اور پھر کوئی مسلمان اسکی اطاعت سے باہر ہوا اور اپنی حکومت کا دعویٰ کیا ، تو وہ باغی ہے ۔ اسکو قتل کر دینا چاہیے ۔

(۴) صدیوں سے اسلامی خلافت کا منصب سلاطین عثمانیہ کو حاصل ہے ، اور اسوقت از رر سے شرع تمام مسلمانان عالم کے خلیفہ و امام رہی ہیں ۔ پس انکی اطاعت و اعانت تمام مسلمانوں پر فرض ہے ۔ جو انکی اطاعت سے باہر ہوا ، اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے نکال دیا ، اور اسلام کی جگہ جاہلیہ مول لی ۔ جس نے انکے مقابلے میں لڑائی کی ، یا انکے دشمنوں کا ساتھ دیا ، اسنے خدا اور اسکے رسول سے لڑائی کی ۔

(۵) صرف خلیفہ اسلام ہی کے لیے یہ حکم مخصوص نہیں ہے ۔ جب کبھی مسلمانوں اور غیر مسلمانوں میں لڑائی ہو ، تو کسی مسلمان کیلئے شرعاً جائز نہیں کہ غیر مسلمان فرج کا ساتھی ہو کر مسلمانوں سے لڑے ۔ یا انکی مدد کرے ۔ اگر کریگا تو بحکم ” من حمل علینا السلاح فلیس منا “ اور نص قرآنی من قتل مومنًا متعمداً فجزاءہ جہنم خالدین فیہا وہ اسلامی جماعت سے خارج ہو جائیگا ۔ اسکا ٹھکانا درخ ہے ۔ البتہ خلیفہ اسلام کے مقابل ہو کر لڑنے کا جرم سب سے زیادہ سنگین جرم ہے ۔

(۶) جب کسی اسلامی حکومت یا جماعت پر غیر مسلم حملہ کریں ، یا حملہ کا قصد کریں ، یا انکی آزادی و خود مختاری کو کسی دوسری طرح نقصان پہنچانا چاہیں ، تو ہر ملک کے مسلمانوں پر یکے بعد دیگرے اپنے بھائیوں کی مدد کرنا ، اور انپر حملہ کرنے والوں سے لڑنا ، فرض ہو جاتا ہے ۔ علی الخصوص ایسی حالت میں جبکہ حملہ آور زیادہ طاقتور ہوں ، اور انکے مقابلہ کی کافی طاقت ان مسلمانوں یا رھاں کی اسلامی حکومت میں نہ ہو ۔ اس صورت میں جہاد کی فرضیت علی الکفایہ نہ ہوگی ، بلکہ مثل نماز روزہ کے فرض عین ۔

(۷) اگر خلیفہ اسلام کو دشمنوں کا ایسا طاقتور گروہ گھیر لے کہ انکا مقابلہ کرنا اسکی طاقت سے باہر ہو ، اور بلا تمام مسلمانان عالم کی فوری مدد و نصرت کے اسلامی ممالک کی حفاظت نہ کرسکے ، تو اس صورت میں تمام دنیا کے مسلمانوں کا ہر ایک رقت فرض ہوگا کہ جس طرح بھی ممکن ہو ، اسکی مدد کریں ۔ اور اسکے دشمنوں سے پیکار ۔

(۸) اسلام کا حکم شرعی ہے کہ جزیرہ عرب کو غیر مسلم اثر سے محفوظ رکھا جائے ، جس میں عراق کا ایک حصہ اور بغداد داخل ہے ، پس اگر کوئی غیر مسلم حکومت اس پر قابض ہونا چاہے ، یا اسکو خلیفہ اسلام کی حکومت سے نکالکر اپنے زیر اثر لانا چاہے ، تو یہ محض ایک اسلامی ملک کے نکل جانے ہی کا مسئلہ نہ ہوگا ، بلکہ اس سے بھی بڑھکر مسلمانوں کے لیے ایک مخصوص سنگین حالت پیدا کر دیگا ۔ یعنی اسلام کی مرکزی سرزمین پر کفر کا اثر چھا رہا ہے ۔ اس حالت میں تمام مسلمانان عالم کا اولین فرض ہوگا کہ اس قبضہ کو رھاں سے ہٹانے کیلئے آٹھ کھڑے ہوں ، اور اپنی تمام قوتیں اسکے لیے وقف کر دیں ۔

(۹) اسلام کے مقامات مقدسہ میں بیت المقدس اُسی طرح محترم ہے جس طرح حرمین شریفین - اسکے لیے لاکھوں مسلمان اپنی جانوں کی قربانیاں، اور یورپ کے آٹھ صلیبی جہادوں کا مقابلہ کرچکے ہیں - پس تمام مسلمانوں کا فرض ہے کہ اس مقام کو دوبارہ غیر مسلموں کے قبضہ میں جانے نہ دیں - علی الخصوص مسیحی حکومتوں کے قبضہ و اقتدار میں - اور اگر ایسا ہو رہا ہے، تو اسکے خلاف دفاع کرنا صرف وہاں کی مسلمان آبادی ہی کا فرض نہ ہوگا - بلکہ بہ یک وقت دفعہ تمام مسلمانان عالم کا -

(خلیفۃ المسلمین اور گورنمنٹ برطانیہ)

جبکہ اسلام کے اٹل اور اپنے پیروں کیلئے دائمی احکام کا یہ حال ہے، تو یکایک اگست ۱۹۱۴ء کو عالمگیر جنگ عالم کا شرارہ رسط یورپ میں چمکا، اور دیکھتے ہی دیکھتے مغربی تمدن کا تمام آتشگیر مادہ جنگ بھڑک اُٹھا: نار اللہ الموقدۃ التي تطلع علی الافئدة ! (اور تھوڑے ہی عرصہ کے بعد جنگ نے مسلمانان ہند کیلئے ایک ایسی نازک صورت اختیار کر لی، جو برطانیہ کی حکومت ہند کی پرری تاریخ میں آج تک کبھی پیش نہیں آئی تھی - یعنی خلیفۃ المسلمین کی فوجیں بھی میدان جنگ میں مشغول ہو گئیں، اور ترکی کے برخلاف برطانیہ نے اعلان جنگ کر دیا -

اس اعلان جنگ کی اطلاع جب سرکاری طور پر ہندوستان میں مشہور کی گئی، تو ساتھ ہی حسب ذیل امور کا بھی اعلان کیا گیا تھا :

(۱) ترکی حکومت کے ساتھ ہماری جنگ دفاعی ہے - نہ کہ حملہ آورانہ - ہم نے دو ماہ تک ہر طرح کا مخالفانہ اور جنگ جویانہ سلوک برداشت کیا، اور پوری کوشش کی کہ کسی طرح یہ جنگ ٹل جائے، لیکن ترکی گورنمنٹ نے برابر اپنے حملے جاری رکھے - اب مجبوراً ہم کو بھی اعلان جنگ کرنا پڑا ہے -

(۲) ہندوستان کے مسلمانوں کو پوری طرح بھروسہ رکھنا چاہیے کہ اس جنگ میں ہمارے یا ہمارے ساتھیوں کی جانب سے کوئی بات ایسی نہ ہوگی جو انکے مذہبی محسوسات کو صدمہ پہنچائے - اسلام کے تمام مقدس مقامات محفوظ رکھنے کے لئے احترام کا پورا پورا لحاظ رکھا جائیگا - اسلام کے مقدس مقام خلافت کے خلاف کوئی کارروائی عمل میں نہ

آئیگی - ہماری جنگ موجودہ ترکی وزارت سے ہے جو جرمنی کے زیر اثر کام کر رہی ہے - نہ کہ خلیفۃ المسلمین سے - گورنمنٹ برطانیہ نہ صرف اپنی جانب سے بلکہ اپنے تمام حلیفوں کی جانب سے ان باتوں کی ذمہ داری لیتی ہے -

یہ خلاصہ اُس سرکاری اعلان کا ہے جو پہلی نومبر سنہ ۱۹۱۴ کو اعلان جنگ کی اطلاع کے ساتھ ہی گورنمنٹ آف انڈیا نے شائع کیا تھا ' اور پھر تمام صوبوں میں سرکاری طور پر اسکی اشاعت کی گئی تھی - حتیٰ کہ ہر کمشنری ' ہر ضلع ' ہر صدر مقام ' ہر شہر کے مسلمانوں کو جمع کر کے مقامی حکام نے اسکی نقلیں بانٹی تھیں اور زبانی پڑھ کر سنایا تھا - برٹش انڈیا کا کوئی مسلمان گھر ایسا نہیں ملیگا جو اس اعلان سے بے خبر چھوڑ دیا گیا ہو - بعد کو " نیر ایست " وغیرہ اخبارات سے ہمیں معلوم ہوا کہ مصر و سوڈان میں بھی بچنسہ یہی اعلان شائع کیا گیا ہے -

اس اعلان کے بعد بھی ہمیشہ ذمہ دار حکام ہند و انگلستان کی زبان سے یہ دونوں باتیں بار بار ظاہر ہوتی رہیں - اگر کسی اظہار و بیان کی مضبوطی میں اعلان کے تکرار اور اشاعت کی کثرت و وسعت کو دخل ہے ' تو بلا خوف رد کہا جاسکتا ہے کہ یہ دونوں باتیں جسقدر وسعت کے ساتھ اور جس طرح بار بار زمانہ جنگ میں کہی گئی ہیں ' اس سے زیادہ کسی انسانی بیان کے اعلان اور کسی انسانی وعدہ کے تکرار کی کوئی صورت دنیا میں نہیں ہوسکتی -

یہ کہنا ضروری نہیں کہ اسوقت میدان جنگ کا کیا حال تھا ؟ برٹش گورنمنٹ کو اپنی زندگی کیلئے لاکھوں سپاہیوں اور توپوں کی جسقدر ضرورت تھی ' اس سے کہیں زیادہ اس اعلان اور اسکی کامیابی کی ضرورت تھی - اگر اسوقت ہندوستان کے مسلمانوں میں ذرا بھی بے چینی پیدا ہوجاتی ' تو نہیں معلوم جنگ کی تاریخ کیسا پلٹا کھاتی ' اور آج نتائج کا حال کیا ہوتا ؟

اس اعلان کا نتیجہ وہی نکلا جو مطلوب تھا - یعنی مسلمانان ہند پر صورت حال بالکل مشتبہ ہوگئی - علماء اس دھوکے میں پڑ گئے کہ جب ترکوں نے انگلستان پر حملہ کیا ہے ' تو شرعاً صورت دفاع کی نہیں ہے بلکہ حملہ

و ہجروم کی ہے، اور اسلئے اسکی شرک فرض کفایہ کا حکم رکھتی ہے - نہ کہ فرض عین کا - پس شرعاً ضروری نہیں کہ مسلمانان ہند بھی اسمیں حصہ لیں - عام مسلمانوں پر یہ اثر پڑا کہ برٹش گورنمنٹ صرف اپنا بچاؤ کر رہی ہے - اسکا مقصود اسلامی ممالک پر قبضہ و تصرف کرنا یا خلیفہ اسلام کی حکومت کو نقصان پہنچانا نہیں ہے - نیز اسلام کے مقدس مقامات یعنی جزیرہ عرب اور بیت المقدس وغیرہ ہر حال میں محفوظ رہینگے - ان تمام باتوں کا نہ صرف انگلستان کی جانب سے وعدہ کیا جانا ہے، بلکہ تمام حلیف حکومتوں کی جانب سے بھی -

نہایت افسوس و روسیاهی کے ساتھ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ مسلمانوں کا نہ یہ مذہبی فیصلہ صحیح تھا - نہ وعدوں اور اعلانوں پر اعتماد - انہوں نے اپنی سیزدہ صد سالہ تاریخ حیات میں شاید ہی کوئی ایسی قومی و مذہبی غلطی کی ہوگی، جیسی اس موقع پر کی، اور جسکے نتائج کی پہلی قسط آج آگے سامنے ہے - فما کان اللہ لیظلمہم ولکن کانوا انفسہم یظلمون !

تھوڑی دیر کیلئے اس سے قطع نظر کرلو کہ احکام شرع کی بنا پر یہ راسے کہانتک صحیح تھی؟ صرف اس پہلو سے دیکھو کہ جن وعدوں پر بھروسہ کیا گیا، آکا کیا حال تھا؟ پرانے وقتوں کی طرح موجودہ زمانے کی سوسائٹی بھی اشخاص کیلئے ضروری سمجھتی ہے کہ ایفائے عہد میں اپنے تئیں شریف ثابت کریں، لیکن بیسویں صدی کی تہذیب میں حکومتوں کیلئے شریف ہونا کوئی ضروری وصف نہیں ہے، اور اگر طاقت موجود ہے تو پھر اخلاقی صداقت کے مطالبہ کا دھم رگمان بھی نہیں کرنا چاہیے - جب وعدوں کا ایفا اور عہد پیمان کی پابندی کمزور حکومتوں کے ساتھ ضروری نہیں سمجھی جاتی، تو پھر محکوم و بے سروسامان رعایا کے ساتھ کیوں ضروری سمجھی جائے؟ جو اپنی وفاداری میں کتے کی طرح قابل تعریف مگر بے زبانی میں اسی کی طرح بے بس بھی ہو؟

انگلستان کی حکومت نے نیولین کے عہد سے لیکر آج تک اپنے وعدوں کو جس طرح پورا کیا ہے، انکی عذرۃ انگیز سرگذشت صفحات تاریخ پر ثبت ہے -

برطانیہ وعدوں کے اعتماد اور انکے ایفاء کی اخلاقی نمائش کا یہ پہلا ہی مرقعہ نہیں ہے۔ ۱۵ - جولائی سنہ ۱۸۱۵ء کو جب نیپولین نے ہلر افان نامی انگریزی جہاز پر قدم رکھا تھا تو اس نے بھی انگلستان کے وعدوں پر اعتماد ہی کیا تھا۔ بے اعتمادی نہیں کی تھی۔ لیکن خون آسپی کے لفظوں میں ”انگلستان نے ہاتھ بڑھا کر اپنا مہمان بنانے کیلئے بلایا، اور جب وہ آگیا تو اسکا خاتمہ کر دیا“ سینٹ ہلینا کی سنگلاخ چٹانیں آج تک سمندر کے طوفانوں کے اندر انگریزی مواعید کی اخلاقی قدر و قیمت کا اعلان کر رہی ہیں !

۴ - اگست سنہ ۱۸۱۵ء کو جنگ رائل لو کے بعد جب شہر پیرس متحدہ افواج کے حوالے کیا گیا، اور اس عہد نامہ کو فرانسیسیوں نے عہد نامہ سمجھا جس پر انگلستان کے نامور ہیرو رڈریک آف ویلنگٹن کے دستخط تھے، تو یقیناً انہوں نے بھی انگلستان پر اعتماد ہی کیا تھا۔ لیکن قبضہ کے بعد جو نتیجہ نکلا، اس پر تاریخ کا اٹل فیصلہ صادر ہو چکا ہے، اور خون انگریز مورخوں کی زبانی اسکا افسانہ سن لیا جاسکتا ہے۔

خون ہندوستان کے گذشتہ سو سالوں کی تاریخ ہی اسکے لیے کافی ہے۔ دوسرے ملکوں کی سرگذشتوں کی طرف نظر اٹھانے کی ضرورت نہیں۔

تاہم مسلمانوں نے بھروسہ کیا۔ اور جنگ کے نتائج کی طرف سے مطمئن ہو گئے۔ انکا رویہ، انکی جانیں، انکے ملک کی تمام قوتیں، بے دریغ خرچ کی گئیں۔ دنیا کی آخری اسلامی حکومت و خلافت کے خاتمہ میں انکی ہر چیز نے پورا پورا کام دیا۔ یہاں تک کہ برٹش گورنمنٹ اپنی تاریخ حیات کے سب سے بڑے مہلک وقت سے بچ گئی، اور وہ فتح مندی مکمل ہو گئی جسکا پہلا نتیجہ اسلامی خلافت کی بربادی و تباہی ہے۔

اٹنائے جنگ ہی میں اس اعتماد کے تمام نتائج ظاہر ہو گئے تھے۔ بغداد پر انگریزی فوج قابض ہو گئی تھی جو جزیرہ عرب کی مقدس سر زمین میں داخل ہے۔ عین حدرد حرم مکہ کے اندر سازشیں کر کے بغارت کرائی گئی اور اسکی وجہ سے جسقدر توہین اس مقدس مقام کی ہوئی تھی وہ ہو کر رہی۔ پھر بھی مسلمانان ہند اپنے اعتماد سے دست بردار نہ ہوئے اور اس انتظار میں رہے کہ یہ جنگ کی عارضی حالتیں ہیں۔ صلح کے بعد ہی برطانیہ اعلان و مواعید کی مقدس صداقت تمام عالم پر آشکارا ہو جائیگی۔

(موجودہ و آئندہ حالت اور احکام شرعیہ)

بحث کے اس تکرر کو ہم دانستہ حذف کر دیتے ہیں کہ جنگ کے بعد ان وعدوں اور اعلانات کا کیا نتیجہ نکلا؟ نہ ہم ان پیہم اعلانات کا یہاں ذکر کریں گے جنگا سلسلہ برابر اٹناے جنگ میں جاری رہا۔ مثلاً وزیر اعظم کی تقریر ۵- جنوری سنہ ۱۹۱۸ - کیونکہ یہ تمام باتیں دنیا کے سامنے ہیں - اور سورج کی روشنی جن چیزوں کو دکھلا دے، انکے لیے بحث و نظر کی روشنی سے مدد لینے کی ضرورت باقی نہیں رہتی -

ہم کو یہاں صرف ایک بات کا فیصلہ کرنا ہے۔ اس کے علاوہ اب نہ کوئی بات ہمارے لیے سوچنے سمجھنے کی باقی رہی ہے - نہ گورنمنٹ کیلئے - نہ صرف موجودہ و آئندہ حالت کا سوال ہے -

احکام شرعیہ اوپر گزر چکے ہیں - پس اگر موجودہ حالت میں تبدیلی نہ ہوئی اور صلح کے نام سے اسلامی خلافت کے خلاف رہی جنگ عمل میں لائی گئی جس کا اظہار ہو رہا ہے، تو نتائج حسب ذیل ہونگے :

(۱) جس وقت خلیفۃ المسلمین نے جنگ میں شرکت کی ہے تو برٹش گورنمنٹ نے اعلان کیا تھا کہ حملہ ان کی جانب سے ہے - انگلستان و حلفاء کی جانب سے نہیں ہے - لیکن اب موجودہ حالت بالکل اس کے برعکس ہے - یعنی خلیفۃ المسلمین کسی غیر مسلم ملک و حکومت پر حملہ آور نہیں ہیں بلکہ غیر مسلم حکومتیں مسلمان آبادیوں اور خلیفۃ اسلام کی حکومت پر قابض ہو رہی ہیں، اور خلیفۃ المسلمین پر حملہ آور ہیں - پس اگر اس حالت میں تبدیلی نہ ہوئی اور عارضی صلح کے بعد بھی یہی حال رہا، تو مسلمانوں کیلئے قطعاً صورت دفاع اور نفع عام کی پیدا ہو جائیگی جب جہاد ہر مسلمان پر فرض عین ہو جاتا ہے - حملہ و ہجوم کی صورت نہ ہوگی کہ فرض علی الکفایہ ہو - لہذا ہندوستان کے ہر مسلمان کا یہ شرعی فرض ہوگا کہ خلیفۃ المسلمین، اور ان تمام اسلامی آبادیوں کی اعانت کیلئے اٹھ کھڑا ہو، جہاں سے اسلامی حکومت ہٹائی جا رہی ہے -

(۲) یہ حقیقت پہلے سے آشکارا تھی، مگر چار سال کی جنگ اور اس کے نتائج نے آخری درجہ یقین تک ظاہر کر دی کہ نہ تو خلیفۃ المسلمین کی موجودہ طاقت غیر مسلم حریفوں کے مقابلے کیلئے کافی ہے - نہ موجودہ

اسلامی ممالک کے مسلمانوں کی - یعنی وہ شکست کھا چکے ہیں اور بعض مقامات کے مسلمانوں کی درماندگی و تباہی غایت درجہ ہلاکت تک پہنچ چکی ہے - جیسے ولایت سمرنا وغیرہ کے مسلمان - پس اس بنا پر بھی مسلمانان ہند کا فرض شرعی ہوگا کہ انکی مدد کیلیے اُٹھ کھڑے ہوں - کیونکہ اگر ایک مقام کے مسلمان دشمن کے مقابلے کی طاقت نہیں رکھتے تو دیگر ممالک کے مسلمانوں پر دفاع میں شریک ہونا فرض ہو جاتا ہے -

(۳) جن بلاد اسلامیہ پر غیر مسلم دخل و تصرف کرنا چاہتے ہیں ، یا کرچکے ہیں گو آخری اعلانات ابھی نہیں کیے گئے - مثلاً ایڈریانویل ، تھریس ، ایشیائے کوچک ، سمرنا ، عراق ، فلسطین ، انکے قرب و جوار میں مسلمانوں کی کوئی ایسی جماعت موجود نہیں جو دشمنوں کے دفاع میں مددگار ہو سکے اور اسکی اعانت کی وجہ سے مسلمانان ہند بڑی الذمہ ہو جائیں - پس اس بنا پر بھی ساری شرعی ذمہ داری مسلمانان ہند کے ذمے عائد ہوتی ہے ، جنکی تعداد دنیا کی تمام اسلامی آبادیوں سے زیادہ ، اور جو بہت سی باتوں میں دوسرے ملکوں کے مسلمانوں سے بہتر حالت رکھتے ہیں -

(۴) عراق کا تمام خطہ دریائے دجلہ تک جزیرہ عرب میں داخل ہے - پس اگر انگریزی قبضہ وہاں قائم رہا ، یا کسی طرح کا بھی انگریزی اقتدار حکم برداری اور نگرانی کے نام سے حاصل کیا گیا ، تو یہ مزید جزیرہ عرب پر غیر مسلم اقتدار کا مسئلہ ہوگا ، اور از روئے شرع مسلمانان ہند کا فرض ہوگا کہ اس اقتدار کے دور کرنے کیلیے حریف کا مقابلہ کریں -

(۵) بیت المقدس اسلام کے مقامات مقدسہ میں داخل ہے - اگر اسپر غیر مسلم اقتدار قائم رکھا جائیگا ، تو تمام دنیا کے مسلمانوں کی طرح ہندوستانی مسلمانوں کا بھی فرض ہوگا کہ دفاع کیلیے مستعد ہو جائیں -

(۶) غرضکہ ہندوستان کے مسلمانوں پر ایک وفادار برٹش شہری کی زندگی بسر کرنا شرعاً ناجائز ہو جائیگا - اور یہ فرائض کی سب سے بڑی کشمکش ہوگی جسمیں کوئی انسانی جماعت مبتلا ہو سکتی ہے - ہندوستان برٹش گورنمنٹ کے ماتحت ہے اور مسلمان اسوقت تک ایک وفادار شہری جماعت کی زندگی بسر کرتے آئے ہیں - لیکن ان حالات کا لازمی نتیجہ یہ نکلیگا کہ انکے مذہبی فرائض ہندوستان کے قانونی فرائض سے ٹکرا جائیں گے - یعنی بمجرد ان حالات کے برٹش گورنمنٹ کی حیثیت از روئے شرع یہ

ہرجائیگی کہ وہ ”اسلام اور مسلمانوں کی حملہ آور دشمن ہے“ اور اسلیے اُس سلوک کی مستحق جو از روئے شرع مسلمانوں کو حملہ آور حریف کے ساتھ کرنا چاہیے ”جب ایسا ہوا“ تو مسلمان مجبور ہو گئے کہ دو راہوں میں سے کسی ایک کو اختیار کر لیں - یا برتس گورنمنٹ کا ساتھ دیں، یا اسلام کا - یہ ناممکن ہو جائیگا کہ دونوں تعلق ایک رقت میں جمع کیے جاسکیں - کیا چہہ کرور سے زائد انسانوں کو اس کشمکش میں مبتلا کر دینا کرٹی عاقبت اندیشانہ فعل ہو سکتا ہے ؟ فرصت کی آخری گھڑیاں گزر رہی ہیں - اگر عارضی فتح مندی کا گھمٹ مہلت دے، تو گورنمنٹ اس سوال پر غور کرے -

اگر انگلستان کے رزرا (نیپولین کے لفظوں میں) وعدہ اسلیے نہیں کیا کرتے کہ وفا کیا جائے، تو کم از کم اُس ایک وعدہ کو تو اس اخلاقی کلیہ سے مستثنیٰ کر دیں جسکو ہندوستان میں برتس گورنمنٹ کا بنیادی اصول حکومت سمجھا جاتا ہے - یعنی آغاز حکومت سے لیکر آج تک اس وعدہ کا قولاً و فعلاً اعلان کہ کسی جماعت کے مذہبی معاملات میں مداخلت نہ کی جائیگی اور ہر جماعت اپنے مذہبی احکام کی بجا آوری میں آزاد ہے - اسی وعدہ کا نتیجہ ہے کہ ہندوستان میں ہر قوم کی طرح مسلمان بھی روز مرہ اپنے مذہبی فرائض انجام دے رہے ہیں - انکی مسجدیں قائم ہیں - پانچ رقت اذان کی صدائیں بلند ہوتی ہیں - کرٹی حاکم مسلمانوں سے یہ نہیں کہتا کہ نماز نہ پڑھو -

لیکن اگر برتس گورنمنٹ خلیفۃ المسلمین کے خلاف اپنے موجودہ طرز عمل پر قائم رہی، اسکے جہاز اسلامی حکومت کے ٹکرے ٹکرے کر دینے کیلیے سمندروں میں دوڑتے رہے، اُسکی فوجیں عراق کی سرزمین پر قابض رہیں جو مقدس جزیرۂ عرب میں داخل ہے، اور ساتھ ہی اس کی بھی متوقع رہی کہ ہندوستان کے بد بخت مسلمان اسکے وفادار رہیں، تو اسکے صرف یہی معنی ہو سکتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو انکے مذہب کے چھوٹے چھوٹے حکموں میں آزادی دینے کیلیے طیار ہے، لیکن جو احکام اسلام کے بنیادی عقائد ہیں اور ان بڑے حکموں میں داخل ہیں جن کے ترک کر دینے سے مسلمان مسلمان نہیں رہتا، انکے لیے چاہتی ہے کہ مسلمان حق و آزادی کا نام بھی زبان پر نہ لائیں اور برطانیہ کی وفاداری کی خاطر اپنے اسلام سے باغی ہو جائیں !

وہ مسلمانوں کو آزادی دیگی کہ نماز پڑھیں جو مذہبی احکام میں شاخ کا حکم رکھتی ہے، لیکن عین اُسی رقت خلیفۃ المسلمین کی حکومت کو صرف قسطنطنیہ میں محدود کر دینے اور تمام بچی بچائی ترکی مملکت کا خاتمہ کر دینے کیلئے اپنے جنگی جہازوں کو بھی با سفورس بھیجیگی، اور اس طرح اسلامی خلافت و امامت کا خاتمہ ہو جائیگا جو مسلمانوں کے مذہبی احکام میں شاخ کا نہیں بلکہ بنیاد اور جڑ کا حکم رکھتی ہے ؟

وہ نماز کے پڑھنے میں مداخلت نہیں کریگی جسکے نہ پڑھنے سے مسلمان گناہگار ہو جاتا ہے، لیکن خلیفۃ المسلمین کو انکی حکومت و مملکت سے محروم کر دیگی جنکی مدد نہ کرنے سے ایک مسلمان گناہگار ہی نہیں بلکہ اسلامی جماعت سے باہر ہو جاتا ہے ؟

وہ مسلمانوں کو حج کے سفر سے نہیں روکتی کیونکہ انکا مذہبی عمل ہے، لیکن وہ خلیفۃ المسلمین کو اپنی بحری و بری فوجی طاقت سے محصور کر کے مجبور کریگی کہ اسلامی مملکتوں کو غیر مسلموں کے حوالہ کر دیں، اور اسوقت مسلمان دفاع کیلئے اٹھیں گے تو کہیں گے کہ یہ بغاوت ہے۔ پھر کیا وہ مسلمانوں کا مذہبی عمل نہ ہوگا ؟ اور کیسا مذہبی عمل ؟ ایسا عمل کہ شرعاً ہزاروں حج سے بڑھکر، اور حج اسکے لیے چھوڑ دیا جاسکتا ہے، لیکن حج کی خاطر وہ نہیں چھوڑا جاسکتا۔

مسلمان اُن مسجدوں اور اُنکے اندر کی نمازوں کو لیکر ہندوستان میں کیا کریں گے جنکی اجازت دیدینے پر برٹش گورنمنٹ کی آزادی کو ناز ہے، جبکہ شریعت کے وہ احکام اُنکے سامنے آ جائیں گے جنکی تعمیل ہزار نمازوں سے بڑھکر اور ہزار روزوں سے زیادہ اشد و اہم ہے، اور جنکی نافرمانی کے بعد نہ تو انکی نماز ہی اُنکے لیے سود مند رہیگی۔ نہ اُنکے روزے ہی اُن کو نجات دلا سکیں گے ؟

(ترک مسوالات)

اس صورت میں مسلمانوں پر ترک و اختیار، دونوں طرح کے احکام شرعاً عائد ہوں گے۔ ” ترک “ سے مقصود یہ ہے کہ بہت سی باتیں جو اسوقت کر رہے ہیں، ترک کر دینی پڑیں گی۔ ” اختیار “ سے مقصود یہ ہے کہ بہت سی باتیں جو اسوقت نہیں کر رہے، کرنی پڑیں گی۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلی چیز یہ ہے جسکو شریعت نے ”ترک مروات“ سے تعبیر کیا ہے - یعنی جو غیر مسلم مسلمانوں کے حریف و دشمن اور حملہ آور فریق کا حکم رکھتے ہوں، ”آپسے کوئی تعلق ایسا نہ رکھنا جو محبت، خدمت، اور اعانت کا تعلق ہو۔ اگر کوئی مسلمان ایسا تعلق رکھیگا، تو اسکا شمار بھی شریعت کے نزدیک ”غیر مسلموں میں ہوگا۔ مسلمانوں میں نہ ہوگا۔“

قرآن حکیم نے اس بارے میں ایک اصولی تقسیم کر دی ہے - تمام غیر مسلم اقوام و افراد کو دو قسموں میں بانٹ دیا ہے - ایک قسم ”غیر مسلموں کی ہے جو نہ تو مسلمانوں سے لڑتے ہیں - نہ انپر حملہ آور ہیں، نہ انکی آبادیوں پر قابض ہونا چاہتے ہیں - دوسری قسم ”غیر مسلموں کی ہے جو یہ ساری باتیں کر رہے ہیں - یعنی لڑتے ہیں، حملہ آور ہیں، اسلامی ممالک پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔“

اسلام کا حکم یہ ہے کہ پہلی قسم کے غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کو نیکی و محبت اور ہر طرح کے احسان و خیر خواہی کا سلوک کرنا چاہیے - اسلام اس سے ہرگز ممانع نہیں - عالمگیر محبت اسکی دعوت حق کا اصل اصول ہے - البتہ دوسری قسم کے غیر مسلموں کے ساتھ وہ اجازت نہیں دیتا کہ اس طرح کا کوئی علاقہ بھی مسلمان رکھیں - اگر رکھینگے تو انکا شمار بھی اللہ اور اسکی شریعت کے دشمنوں میں ہوگا - ایک مسلمان کے سارے گناہوں سے شریعت درگزر کرلے سکتی ہے، لیکن اگر وہ ”غیر مسلموں سے محبت کرتا ہے، یا کسی طرح کا واسطہ رکھتا ہے، تو یہ گناہ نہیں ہے - نفاق ہے - اور منافق مومن نہیں ہے۔“

قرآن نے یہ تقسیم سورہ ممتحنہ میں کر دی ہے: لَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ

لَمْ يَقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِكُمْ أَنْ تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا

إِلَيْهِمْ، أِنَّ اللَّهَ يَحِبُّ الْمُقْسِطِينَ - اِنَّمَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ قَاتَلُوكُمْ

فِي الدِّينِ وَخَرَجُوا مِنْ دِيَارِكُمْ وَظَاهَرُوا بِعَدَاوَتِكُمْ أَنْ تَبَرُّوهُمْ

وَمَنْ يُتَوَلَّهِمْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ - [۴۰ : ۱۰]

اور اسی سورۃ کے اوائل میں فرمایا : یا ایہا الذین آمنوا ! لا تتخذوا

عدوی وعدوکم اولیاء ، تلقون الیہم بالمودۃ وقد کفرنا بما جاءکم من الحق ؟ الخ
مسلمانو ! جو غیر مسلم تمہارے اور تمہارے خدا کے دشمن ہیں ، اُنکو اپنا

دوست نہ بناؤ - اور سرورۃ مائدہ میں ہے : لا تتخذوا الیہود والنصارى اولیاء ،

بعضہم اولیاء بعض - ر من یتولہم منکم فانہ منکم (۵ : ۵۴) اُن یہود و نصاریٰ
کو جو مسلمانوں کی دشمنی اور نقصان رسانی میں سرگرم ہوں ،
اپنا دوست نہ بناؤ - اور جو مسلمان بنایگا ، خدا کے حضور اسکا شمار بھی

اُنہی میں ہوگا - اس سے بھی زیادہ واضح فرمایا : لا یتخذوا المومنون الکافرین

اولیاء من دن المومنین (۳ : ۲۸) اور لا تتخذوا الکافرین اولیاء من دن
المومنین (۴ : ۱۴۳) یعنی جبکہ غیر مسلموں اور مسلمانوں میں باہم
جنگ ہو ، تو مسلمانوں کو نہیں چاہیے کہ اپنے بھائیوں کو چھوڑ کر اُن کے
دشمنوں کو اپنا دوست بنالیں - ” من دن المومنین “ جہاں جہاں آیا ہے ،
اس نے واضح کر دیا ہے کہ مقصود ہر قسم کے غیر مسلموں سے ترک موالات
نہیں ہے ، بلکہ ایک خاص قسم اور ایک خاص حالت - اسی طرح سورۃ
عمران میں ہے : لا تتخذوا بطانۃ من دنکم لا یالزنکم خبالا - ردنا ما عنکم ،

قد بدت البغضاء من افواہہم وما تخفی فی صدورہم اکبر (۳ : ۱۱۸)

(راقعۃ حاطب بن ابی بلتعہ)

سورۃ ممتحنہ کے شان نزول کا واقعہ اس بارے میں مسلمانوں کیلئے
بڑا ہی عبرت انگیز ہے - بخاری و مسلم میں حضرت علی سے مروی ہے کہ
حاطب بن ابی بلتعہ مہاجرین صحابہ اور شرکاء بدر میں سے تھے - آنحضرت صلعم
نے مکہ پر چڑھائی کا قصد کیا تو انہوں نے کسی بری نیت سے نہیں ،
صرف اپنے اہل و عیال کی حفاظت کے خیال سے ایک خط لکھ کر مکہ میں
اطلاع دیدینی چاہی - ر حی الہی سے آنحضرت اسپر مطلع ہو گئے اور راستے
ہی میں سے خط پکڑا منگوا یا - جب حاطب سے پوچھا گیا تو انہوں نے
معذرت کی اور کہا ” ما فعلت هذا کفرا ولا ارتدادا “ حضورؐ عمرؓ نے چاہا کہ
انہیں قتل کر دیں اور کہا ” انه منافق - قد خان الله ورسوله “ یہ منافق ہے - اس
نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ خیانت کی ! اسپر سورۃ ممتحنہ کا نزول ہوا -

اس واقعہ میں ہمارے لیے بڑی ہی عبرت ہے - 'حاطب بن ابی بلتعہ' مہاجرین و بدریہین میں سے تھے - انہوں نے صرف اپنے اہل و عیال کی حفاظت کے خیال سے خط لکھا تھا - لیکن اسپر بھی اللہ کی جانب سے یہ عتاب نازل ہوا ، اور حضرت عمر قتل کر دینے کیلئے آئے کہ یہ منافق ہے - غور کرنا چاہیے کہ جب بارجون علاقہ قرابت ، مخالف و محارب فریق کے ساتھ اتنا تعلق بھی گوارا نہیں کیا گیا ، تو پھر ان مسلمانوں کا شرعاً کیا حکم ہونا چاہیے جو بارجون برتس گورنمنٹ کے محارب فریق ہونے کے ، ہر طرح کی محبت و موالات اور اعانت و نصرت کے تعلقات اُسکے ساتھ رکھتے ہیں - اور جنکا اب تک یہ حال ہے کہ اُسکے درباروں کے دیے ہوئے بے سود خطابوں تک کو اپنے دین و ایمان سے زیادہ عزیز سمجھتے ہیں ؟ علی الخصوص ان مدعیان علم و تقدس کا حال قابل تماشا ہے جنکو انکی بارگاہوں سے ”شمس العلماء“ کے خطابات ملے ہیں ، اور جو اپنے ٹٹیں اسلام کی دینی ریاست کا ارلین حقدار اور مسلمانوں کی مذہبی پیشوائی کا سب سے زیادہ مستحق ظاہر کرتے ہیں - یا سبحان اللہ ! مسلمانوں پر انکی قومی بدبختی کا اس سے بڑھکر آر کر کن سا رقت آ سکتا ہے ؟ جن لوگوں کو اسلام اور اسکی کتاب قطعاً منافق قرار دے رہی ہو ، اور جو اللہ کے نزدیک اسکے بھی حقدار نہیں کہ مسلمانوں کی صف میں جگہ پائیں ، انکو مسلمانوں کی دینی ریاست و پیشوائی کا دعویٰ ہے ، وہ مسلمانوں کی بڑی بڑی درسگاہوں کے مالک ہیں جہاں صبح شام انہی کتابوں کا درس دیا جاتا ہے جن میں یہ تمام احکام درج ہیں ، اور پھر اس سے بھی عجیب تر یہ کہ بہت سے مسلمان ہیں جو انکی پیشوائی کو جان و دل سے مان رہے ہیں ، اور انکے آگے عقیدت و ارادت کا سر جھکا کر اللہ اور اُسکے رسول سے گردن موڑ رہے ہیں !

مدار روزگار سفلہ پرور را تماشا کن !

الذین یتخذون الکافرین
ارلیاء من ذلک المومنین
أیبتغون عندہم العزۃ ؟
فان العزۃ للہ جمیعاً !

جو مسلمان ، مسلمانوں کو چہرہ کرانکے
مخالف غیر مسلموں کو اپنا درست بنا
رہے ہیں ، تو کیا وہ چاہتے ہیں کہ انکی
بارگاہوں سے عزت حاصل کریں ؟ اگر عزت
ہی کی طلب ہے تو یاد رکھیں کہ اصلی

(۱۳۸ : ۴)

اور سچی عزت دینے والے وہ نہیں ہیں - ہر طرح کی عزتیں اللہ ہی کیلئے ہیں ، اور ایک مسلمان کو ملسکتی ہیں تو اسی کی چوکھٹ سے -

سورہ نساء میں یہ تمام خصلتیں منافقوں کی قرار دی ہیں - اُنکا حال یہ ہوتا ہے کہ ایک ہی رقت میں اسلام رکھر، دُورنوں سے ساز باز رکھنا چاہتے ہیں - یعنی وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان بھی رہیں، اور اسلام کے مخالفوں سے بھی رسم و راہ جاری رہے - مذبذبین بین ذالک - لا الیٰ ہا ارلاء، ولا الیٰ ہا ارلاء (۴ : ۱۴۳) تو ایسے لوگوں کی نسبت فرمایا: یا ایہا الذین آمنوا لا تتخذوا الکافرین اولیاء من دین المومنین - اتریدون ان تجعلوا لله علیکم سلطانا مبینا ؟ ان المنافقین فی الدرك الاسفل من النار (۴ : ۱۴۳)

اسلام تو ایک مسلمان کیلئے اسکو بھی جائز نہیں رکھتا کہ اگر اسکے ماں باپ، بھائی بہن، مسلمانوں سے لورہ ہوں، تو اُنسے بھی کسی طرح کا واسطہ رکھے: لا تتخذوا اباکم و اخوانکم اولیاء ان استحبوا الکفر علی الایمان و من یتولہم منکم فارلک ہم الظالمون [۹ : ۲۳] اور جو مسلمان ایسے وقتوں میں معارب غیر مسلموں سے محبت و اعانت کا تعلق رکھیں، خواہ وہ اُنکے ماں باپ ہی کیوں نہوں، اُنکے مومن ہونے کی صاف صاف نفی کر رہا ہے: لا تجد قوما یؤمنون باللہ و الیوم الآخر، یوادون من حاد اللہ و رسولہ و لو کانوا اباؤہم (۵۸ : ۲۲) مہاجرین صحابہ نے اس حکم کی تصویر بنکر دنیا کو دکھلادیا کہ ایمان کے معنی کیا ہیں ؟

پس اب فیصلہ کرلو کہ اُن لوگوں کا حکم کیا ہونا چاہیے جو ایسے وقتوں میں بھی معارب غیر مسلموں کے دیے ہوئے خطابوں سے پیار کرینگے، اُن کے دیے ہوئے تمنوں کو (جن میں سے اکثر اسلام فرورشی ہی کے صلے میں ملے ہیں) اپنے سینوں پر جگہ دینگے، اُنکی بارگاہوں میں جا کر اطاعت و تعبد کا سر جھکا دینگے، اررآہ، ان سب سے بھی بڑھکر وہ، جو اُنکی راہوں میں غلاموں کی طرح بچھینگے، اُنکے حکموں پر کتوں کی طرح لوٹینگے، اُنکی خدمت و چاکری کے عشق میں اپنے دین و ایمان کے ایک ایک ذرے تک کو نثار کر دینگے ؟ فیالہ و للمسلمین ! من ہذہ الفارقة الیٰ ہی اعظم فراقہ الدین، و الرزقۃ الیٰ ما رزیٰ بمثلہا سبیل المومنین !

لمثل هذا ینزب القلب من کمد

ان کان فی القلب اسلام و ایمان !

(گورنمنٹ کیلیے اصلی سوال)

گورنمنٹ صرف اپنے فوائد و اغراض کو سامنے رکھ کر غور کر لے کہ ہندوستان کے کروڑوں انسانوں کو جو دنیا اور زندگی کی ساری چیزوں سے زیادہ اپنے مذہب کو محبوب رکھتے ہوں، ایک ایسی اٹل اور علاج کشمش میں ڈال دینا بہتر ہوگا جس میں ایک طرف ان کے مذہبی احکام ہوں، دوسری طرف برٹش گورنمنٹ؟ اور دونوں باتیں اس طرح آپس میں لڑ جائیں کہ کسی طرح بھی جمع نہ ہو سکیں؟ اگر انسان کے ہاتھ اشارے کرے طوفانوں اور بجلیوں کو بلا سکتے ہیں، تو یقیناً برٹش گورنمنٹ اس وقت اس آدمی کی طرح سمندر کے کنارے کھڑی ہے جو اپنے ہاتھوں کو ہلا کر طوفانوں کو دعوت دے رہا ہو۔

فی الحقیقت یہ نہ تو کوئی الجھاؤ ہے نہ کوئی مشکل مسئلہ۔ بالکل صاف اور سیدھی سی بات ہے۔ بشرطیکہ حاکمانہ غرور اور طاقت کے نشہ میں چند لمحوں کیلیے عقل و انصاف کی گنجائش نکالی جاسکے۔ مسلمانوں کا مطالبہ شرعی احکام کا مطالبہ ہے۔ اسلام کے احکام کوئی راز نہیں ہیں جن تک گورنمنٹ کی رسائی ممکن نہ ہو۔ چھپی ہوئی کتابوں میں مرتب ہیں اور مدرسوں کے اندر شب و روز زیر درس و تدریس رہتے ہیں۔ پس گورنمنٹ کو چاہیے کہ صرف اس بات کی جانچ کر لے کہ واقعی اسلام کے شرعی احکام یہی ہیں یا نہیں؟ اگر ثابت ہو جائے کہ ایسا ہی ہے تو پھر صرف دو ہی راہیں گورنمنٹ کے سامنے ہونی چاہئیں۔ یا مسلمانوں کیلیے ان کے مذہب کو چھوڑ دے، اور کوئی بات ایسی نہ کرے جس سے ان کے مذہب میں مداخلت ہو اور وہ اپنے مذہبی احکام کی بنا پر برٹش گورنمنٹ کے خلاف ہو جانے پر مجبور ہو جائیں۔ یا اعلان کر دے کہ اسکو مسلمانوں کے مذہبی احکام کی کوئی پروا نہیں ہے، نہ اس پالیسی پر قائم ہے کہ ان کے مذہب میں مداخلت نہ ہو۔ اسکو صرف زیادہ سے زیادہ زمین چاہیے، زیادہ سے زیادہ حکومت چاہیے، مرسل کے تیل کے چشمے چاہئیں، عراق کی زرخیز زمین کی دولت چاہیے، اور اسلامی خلافت کا خاتمہ، تاکہ دنیا میں اسکا مشرقی حریف باقی نہ رہے۔ اگر ایسا کرنے کی وجہ سے مسلمانوں کے مذہبی احکام باطل ہوتے ہیں تو ہوں۔ اگر انہی طرح طرح کے اشد فرائض عائد ہو جائے ہیں تو ہوا کریں۔ آنکر ہر حال میں برٹش گورنمنٹ کا رفا دار غلام بنا رہنا چاہیے، اگرچہ اسکی خاطر اپنے مذہب سے بھی دست بردار ہو جانا پڑے۔

اسکے بعد مسلمانوں کیلئے بھی نہایت آسان ہو جائیگا کہ اپنا وقت بے سربسور و فغاں میں ضائع نہ کریں، اور برٹش گورنمنٹ اور اسلام، ان دونوں میں سے کوئی ایک بات اپنے لیے پسند کر لیں۔

فصل

(راہ عمل)

لیکن ہمارے لیے اصلی سوال اب یہ نہیں رہا ہے کہ گورنمنٹ کو کیا کرنا تھا؟ صرف یہ ہے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

اس بارے میں راہ عمل مسلمانوں کیلئے ہمیشہ سے ایک ہی رہی ہے، اور ہمیشہ کی طرح اب بھی ایک ہی ہے۔ میں نے ہمیشہ مسلمانوں کو اُسی کی طرف بلایا ہے، اور جب کبھی میری زبان بلانے کیلئے کھلیگی تو صرف اُسی کیلئے کھلیگی۔ یعنی ہندوستان کے مسلمان اپنی جماعتی زندگی کی اُس معصیت سے باز آجائیں جس میں ایک عرصہ سے مبتلا ہیں، اور جسکی وجہ سے فوز و فلاح کے تمام دروازے انپر بند ہو گئے ہیں۔

”جماعتی زندگی کی معصیت“ سے مقصود یہ ہے کہ ان میں ایک ”جماعت“ بنکر رہنے کا شرعی نظام مفقود ہو گیا ہے۔ وہ بالکل اُس گم کی طرح ہیں جسکا اندر جنگل کی جھاڑیوں میں منتشر ہو کر گم ہو گیا ہو۔ وہ بسا اوقات یکجا اکٹھے ہو کر اپنی جماعتی قوت کی نمائش کرنا چاہتے ہیں۔ کمیٹیاں بناتے ہیں۔ کانفرنسیں منعقد کرتے ہیں۔ لیکن یہ تمام اجتماعی نمائشیں شریعت کی نظروں میں ”بہیڑ“ اور ”اندرہ“ کا حکم رکھتی ہیں۔ ”جماعت“ کا حکم نہیں رکھتا۔ ”بہیڑ“ اور ”جماعت“ میں فرق ہے۔ پہلی چیز بازاروں میں نظر آ جاتی ہے جب کوئی تماشہ ہو رہا ہو۔ دوسری چیز جمعہ کے دن مسجدوں میں دیکھی جا سکتی ہے جب ہزاروں انسانوں کی منظم و مرتب صفیں ایک مقصد، ایک جہت، ایک حالت، اور ایک ہی کے پیچھے مجتمع ہوتی ہیں۔

شریعت نے مسلمانوں کیلئے جہاں انفرادی زندگی کے اعمال مقرر کر دیے ہیں، وہاں انکے لیے ایک اجتماعی نظام بھی قرار دیدیا ہے۔ وہ

کہتی ہے کہ زندگی اجتماع کا نام ہے - افراد و اشخاص کوئی شے نہیں - جب کوئی قوم اس نظام کو ترک کر دیتی ہے تو گو اس کے افراد فرداً فرداً کتنے ہی شخصی اعمال و طاعات میں سرگرم ہوں، لیکن یہ سرگرمیاں اس بارے میں کچھ سود مند نہیں ہو سکتیں، اور قوم جماعتی معصیت میں مبتلا ہو جاتی ہے - قرآن و سنۃ نے بتلایا ہے کہ شخصی زندگی کے معاصی کسی قوم کو یکایک برباد نہیں کر دیتے - اشخاص کی معصیت کا زہر آہستہ آہستہ کام کرتا ہے - لیکن جماعتی زندگی کی معصیت کا تخم (یعنی نظام جماعتی کا نہونا) ایسا تخم ہلاکت ہے جو فوراً بربادی کا پھل لاتا ہے اور پوری قوم تباہ ہو جاتی ہے -

شخصی اعمال کی اصلاح و درستگی بھی نظام اجتماعی کے قیام پر موقوف ہے - مسلمانان ہند جماعتی زندگی کی معصیت میں مبتلا ہیں - اگر جب جماعتی معصیت سب پر چھا گئی ہے تو افراد کی اصلاح کیونکر ہو سکتی ہے ؟

کتاب و سنۃ نے جماعتی زندگی کے تین رکن بتلائے ہیں :

تمام لوگ کسی ایک صاحب علم و عمل مسلمان پر جمع ہو جائیں -

وہ جو کچھ تعلیم دے، ایمان و صداقت کے ساتھ قبول کریں -

قرآن و سنت کے ماتحت اس کے جو کچھ احکام ہوں، ان کی بلا چوں و چرا تعمیل و اطاعت کریں -

سب کی زبانیں گونکی ہوں - صرف اسی کی زبان گویا ہو - سب کے دماغ بیکار ہو جائیں - صرف اسی کا دماغ کار فرما ہو - لوگوں کے پاس نہ زبان ہو نہ دماغ - صرف دل ہو جو قبول کرے، صرف ہاتھ پاؤں ہوں جو عمل کریں !

اگر ایسا نہیں ہے، تو ایک بھیڑ ہے، ایک انبوہ ہے، جانوروں کا ایک جنگل ہے، کنکر پتھر کا ایک ڈھیر ہے، مگر نہ تو ”جماعت“ ہے نہ ”امت“ - نہ ”قوم“ نہ ”اجتماع“ - اینٹیں ہیں مگر دیوار نہیں - کنکر ہیں مگر پہاڑ نہیں - قطرے ہیں مگر دریا نہیں - کڑیاں ہیں جو تکرے تکرے کر دی جاسکتی ہیں، مگر زنجیر نہیں ہے جو بڑے بڑے جہازوں کو گرفتار کر لے سکتی ہے -

یہ وقت فصل کاٹنے کا تھا ، نہ کہ دانہ ڈالنے کا - لیکن مسلمانوں نے اپنے جد و جہد کی تمام گذشتہ زندگی کم گشتگی رہے حاصلی میں ضائع کر دی - حتیٰ کہ سچ مچ رہ وقت آگیا جسکی تباہیوں کا تخیل پیدا کر کے کہہی ڈرانے والے ڈرایا کرتے تھے : فقد جاء اشراطها - فانی لہم اذ جائتہم ذکرہم ؟ (۲۱ : ۴۷) اب بھی اگر کام ہے تو یہی کام ہے اور غم ہونا چاہیے تو اسی کا - سچے کام کے کرنے میں کٹنی ہی دیر ہر جائے ، مگر جب کہہی کیا جائے ، سچائی ہے - اس کے لیے نہ تو کوئی وقت نا موافق ہے نہ کوئی جگہ مخالف - اسکے کرنے میں جس قدر دیر کی جائیگی ، معصیت اور ہلاکی ہے - لیکن جب کہہی بھی کر دیا جائے ، سچائی اور نیکی ہے ، اور آسکا ثمرہ زندگی اور کامرانی - تمہاری سب سے بڑی گمراہی یہ ہے کہ خاص خاص وقتوں میں خاص خاص کاموں کا نام سن پائے ہو ، اور پھر چیخنے چلانے لگتے ہو ، اور جس طرح اونگھتا ہوا آدمی ایک مرتبہ چونک اٹھتا ہے ، یکایک اعتقاد اور عمل ، دنوں تمہیں یاد آ جاتے ہیں - حالانکہ نہ تو خاص خاص وقتوں ہی میں تمہاری مصیبت وجود میں آئی ہے - نہ کامیابی کی راہ کسی خاص کام کے پڑ جانے پر موقوف ہے - تمہاری مصیبت دائمی ، تمہارا ماتم ہمیشگی کا ، تمہارا ررگ تمہاری ہڈیوں کے اندر سمایا ہوا اور چوبیس گھنٹے تمہارے ساتھ ہے - اور تھیک اسی کی طرح تمہاری کامیابی و خوشحالی بھی ہر وقت تمہارے سایے کے ساتھ ساتھ درز رہی ہے - تم وقت پر سامنے آ جانے والی چیزوں کی فکر نہ کر ، بلکہ اپنا ہمیشہ کا معاملہ ایک مرتبہ درست کرلو - جب تک دل و جگر کا علاج نہ ہوگا ، روز نئے نئے ررگ لگتے رہینگے - خلافت کا مسئلہ کل سے سامنے آیا ہے ، مگر تمہاری بربادی کا مسئلہ کل ہی سے نہیں شروع ہوا - پس نادانوں ! تمہارا اصلی کام کوئی خاص مسئلہ اور کوئی خاص تحریک نہیں ہے - ہمیشہ سے اور ہمیشہ کیلئے صرف یہی ہے کہ ” ہندوستان کے مسلمانوں کو مسلمان بننا چاہیے “ اور قوم رفد ، دنوں اعتبار سے تھیک تھیک اسلامی زندگی اختیار کر لینی چاہیے “ اس ایک کام کے انجام دینے پر سارے کام خود بخود انجام پا جائینگے صرف نظر بندوں کے استقبال میں گرد و خاک نہ اڑاتے رہو - غفلت ، بندہ ! اپنے ایمان کے سرخ میں نکلو کہ اس نے کیوں تم کو ہمیشہ کیلئے چھوڑ دیا ہے ؟

درازمی شب و بیداری من ایں ہمہ هست
ز بخت من خبر آرید تا کجا خفتست

اسی مسئلہ خلافت کو دیکھو! شرعی اور سیاسی دونوں پہلوؤں سے کسقدر اہم اور نازک معاملہ ہے؟ اگر آج مسلمانوں میں آنکے ائمہ و مشاہیر موجود ہوتے، تو انہیں سے بھی ہر شخص زبان نہ کھولتا، کسی ایک صاحب نظر و عمل کے احکام پر سب کاربند ہو جائے۔ لیکن اسکے مقابلہ میں آج تمہارا کیا حال ہو رہا ہے؟ کمیٹیوں اور تجویزوں کی عادت برسوں سے پڑی ہوئی ہے۔ اسی قینچی سے اس پہاڑ کو بھی کٹنا چاہتے ہو۔ ہر زبان تجویزیں پیش کر رہی ہے۔ ہر قلم امام و مجتہد کی طرح احکام نافذ کر رہا ہے۔ کوئی کچھ کہتا ہے۔ کوئی کچھ کہتا ہے۔ کوئی دھنہ بلاتا ہے۔ کوئی بائیں۔ کیا اس طوائف الملوک کی اور نہ ہی انارکی کے ساتھ جو عالم فکر و نظر کا ایک پورا پورا غدر ہے، یہ مہم سرہوسکتی ہے؟

شرعی پہلو سے مسئلہ کا یہ حال، کہ ایک صاحب نظر و اجتہاد دماغ کی ضرورت ہے جسکا قلب کتاب و سنت کے معارف و غوامض سے معمور ہو۔ وہ اصول شرعیہ کو مسلمانان ہند کی موجودہ حالت پر، انکے توطن ہند کی حدیث العہد نوعیت پر، ایک ایک لمحہ کے اندر متغیر ہو جانے والے حوادث جنگ و صلح پر، تھیک تھیک منطبق کرے، اور پھر تمام مصالح و مقاصد شرعیہ و ملیہ کے تحفظ و توازن کے بعد فتویٰ شرع صادر کرتا رہے۔ نہ ہر عالم اسکا اہل ہے۔ نہ ہر مدرسہ نشین اس کا اسرار شناس۔

سیاسی پہلو سے دیکھا جائے تو جو کام فوجوں اور حکومتوں کی طاقت سے انجام پاسکتا ہے، اسکو تم صرف اپنی جماعتی قوت کے استعمال سے حاصل کرنا چاہتے ہو۔ پھر کسقدر نامرادی ہے کہ وہ قوت بھی ناپید؟

بلاشبہ لوگوں میں احساس اور طلب کی کمی نہیں۔ نہ جوش و سرگرمی کی کمی ہے، اور یہ بڑی ہی قیمتی چیز ہے۔ لیکن اگر صحیح راہ عمل اختیار نہ کی گئی تو یہی بات سب سے زیادہ مضر بھی ہو جاسکتی ہے۔ جذبات کی مثال استیم کی سی ہے۔ بغیر استیم کے کچھ نہیں ہو سکتا، لیکن وہ بھی بغیر مشین اور سائق (قاریور) کے کچھ نہیں کر سکتی۔ مشین اسکی طاقت کو ترتیب دیتا، اور قاریور اس سے کام لیتا ہے۔ اگر یہ دونوں باتیں

نہیں ہیں ' تو اس سے زیادہ کڑی خطرناک اور مہلک چیز بھی نہیں
 ہو سکتی - کاش وہ نہ ہوتی - وہ تینوں کو منزل مقصود پر پہنچاتی ہے ، مگر
 انجنوں کو گرا کر ہزاروں انسانوں کو ہلاک بھی کر دیتی ہے !

” جذبات “ اُسی وقت کام دے سکتے ہیں ، جب انکو مرتب کرنے اور
 انپر حکم و قضاء کیلیے ” ادراک “ اور ” دماغ “ بھی موجود ہو -
 و ذلک من عمل النبوة ، ولكن لا یعقلها الا العاقلون -

بہر حال اسوقت ، اور ہمیشہ سے ، اور ہمیشہ کیلیے ، ” راہ عمل “
 یہی ہے کہ مسلمان سب سے پہلے اسلام کی جماعتی زندگی اختیار کریں -
 اسی پر مسئلہ خلافت اسلامی کے بھی تمام مہمات و اعمال موقوف ہیں -

(آل انڈیا خلافت کمیٹی اور فراہمی زراعت)

تمام مسلمانوں کو اُن ہمدردان ملک کا شکر گزار ہونا چاہیے جنہوں نے
 آل انڈیا خلافت کمیٹی کی بنیاد ڈالی اور تمام ملک میں اسکی شاخوں
 کے قیام کا سر سامان کیا - اس کمیٹی کا قیام وقت کا صحیح اور مفید
 کام ہے بشرطیکہ پوری مستعدی کے ساتھ ایک کثیر طاقثرت فذ کی فراہمی
 میں مسلمان اسکا ساتھ دیں - ہر حال میں پہلی اور ناگزیر منزل مال کی
 پیش آتی ہے - روپیہ کی ایک بڑی مقدار بجائے خود کام اور طاقت ہے -
 خلافت کمیٹی کو تبلیغ و اشاعت کا وسیلہ اور فذ کی فراہمی کا
 نظام سمجھنا چاہیے ، اور اسکا کام پوری مستعدی اور سرگرمی سے جاری
 رہنا چاہیے - ہندوستان کا کوئی گوشہ ، کوئی آبادی ، کوئی گاؤں ، خلافت
 کمیٹی سے خالی نہ رہے - نہ کوئی مسلمان ایسا باقی رہے جو ہندوستان
 میں بسنا ہو اور خلافت فذ کیلیے اس سے چندہ نہ مانگا گیا ہو -

تم نے غور سے سنا یا نہیں ؟ میں نے کیا کہا ؟ میں نے کہا ” چندہ
 نہ مانگا گیا ہو “ - یہ نہیں کہا کہ ” چندہ دیا ہو “ - یعنی اگر تم ہزار
 طرح کی فکروں اور نئی نئی تجویزوں اور سوالوں سے بالکل خالی
 الذہن ہو کر مہینے در مہینے کے اندر صرف یہی در کام انجام دیدر - ایک
 زمین کا - دوسرا انسانوں کا - زمین کا یہ کہ کوئی گوشہ خلافت کمیٹی کے وجود
 سے خالی نہ رہے - انسانوں کا یہ کہ کسی مسلمان فرد کے کان طلب اعانت
 کے سوال سے نا آشنا نہ رہجائیں ، تو یاد رکھو کہ بجائے خود یہ ایک بڑا سے
 بڑا کام ہوگا جو تم ہندوستان میں انجام دے سکتے ہو -

جو لوگ ایثار قربانی کی بڑی بڑی مہموں کا دعوا کیا کرتے ہیں ، انکو سب سے پہلے مالی قربانی کی ابتدائی اور سہل ترین منزل سے گزر جانا چاہیے ۔ اگر وہ روپیہ بھی نہیں دے سکتے اور اسکی فراہمی کی زحمت بھی ان سے چھیلی نہیں جا سکتی ، تو پھر خواہ کتنے ہی بڑی بڑی اور پرجوش اُمادگیوں کا اظہار کریں ، نہ عقل اُنکی تصدیق کریگی ، نہ شرع قبول کریگی ۔

لیکن خلافت کمیٹی کا کام مسلمانوں کو نظام جماعتی و شرعی کے قیام سے مستغنی نہیں کر دے سکتا ۔ خلافت کمیٹی روپیہ جمع کریگی ۔ ایجی ٹیشن جاری رکھیگی ۔ تبلیغ و اشاعت کریگی ۔ لیکن نہ تو وہ قوم کو سنبھال سکتی ہے ، نہ کمیٹیوں سے ”جماعت“ پیدا ہو سکتی ہے ، نہ شرعی نظام کی قائم مقامی ہو سکتی ہے ۔ وہ خود احکام شرعیہ کے علم کیلئے ، اپنے قیام و تکمیل کیلئے ، دفع تفرقہ و انتشار کیلئے ، اور روح اجتماع و قوام کے نفوذ کیلئے ایک بالا تر قوت حاکمہ و نافذہ کی محتاج ہے ۔ اور اگر وہ نہیں ہے تو پھر اسکی ہستی بھی قائم نہیں رہ سکتی ۔

نظام شرعی یہ نہیں ہے کہ ہر شخص فرداً فرداً سوچتا رہے کہ مسئلہ خلافت کیلئے کیا کرنا چاہیے ؟ اور اخباروں میں آرٹیکل لکے جائیں کہ عملی راہ کیا ہونی چاہیے ؟ اور نہ ہر شخص یا چند آدمیوں کی گڑھی ہوئی کمیٹی کو یہ حق ہے کہ لوگوں کو کسی راہ کی طرف دعوت دینا شروع کر دے ۔ یہ کام صرف ایک صاحب نظر و اجتہاد کا ہے جسکو قوم نے بالاتفاق تسلیم کر لیا ہو ۔ وہ وقت اور حالت پر اصول شریعت کو منطبق کریگا ۔ ایک ایک جزئیہ حادث و واقعات پر پروری کار دانی و نکتہ شناسی کے ساتھ نظر ڈالیگا ، اُمت و شرع کے اصولی مصالح و فوائد اس کے سامنے ہونگے ۔ کسی ایک گوشے ہی میں ایسا مستغرق نہ ہو جائیگا کہ باقی تمام گوشوں سے بے پروا ہو جائے :

حفظت شیئاً و غاببت عنک اشیاء !

سہا سے بڑھکر یہ کہ اعمال مہمہ اُمت کی راہ میں منہاج نبوت پر اسکا قدم استوار ہوگا ، اور ان ساری باتوں کے علم و بصیرت کے بعد ہر وقت ، ہر لمحہ ، ہر حالت ، کے لیے احکام شرعیہ کا استنباط کریگا

(اتبعون ، اہد کم سبیل الرشاد)

عزیزانِ ملت ! اس طویل طویل صحبت میں جسقدر باتیں میں نے تم سے کہی ہیں، ان میں کوئی بات بھی ایسی نہیں ہے جو میری زبان پر نئی ہو۔ بلکہ یہ تمام بھی باتیں ہیں جو پچھلے دس سالوں سے برابر کہتا رہا ہوں، اور اگر الہلال والبلاغ کی پیہم صدائیں تمہارے حافظہ میں فراموش نہیں ہوگئی ہیں، تو تم اسکی تصدیق کرسکتے ہو۔ تمہارے رہبروں اور پیشواؤں کی رائیں اور صدائیں کلنی ہی مضطرب و متزلزل رہی ہوں، لیکن میری طرف دیکھو! میں ایک انسان تم میں موجود ہوں جو دس سال سے صرف ایک ہی صدائے دعوت بلند کر رہا، اور صرف ایک ہی بات کی جانب تڑپ تڑپ کر بلا رہا اور لوت لوت کر پکار رہا ہے۔ و لکن لا تحبون الناصحین (۲۸ : ۷) مگر افسوس کہ تم حقیقی اور سچی بات کہنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔ تم نمائش کے پجاری، شر و ہنگامہ کے بندے، اور وقتی جذبات و انفجار ہیچان کی مخلوق ہو۔ تم میں نہ امتیاز ہے نہ نظر۔ نہ تم جانتے ہو نہ پہچانتے ہو۔ تم جسقدر تیزدور کرتے ہو، اتنی ہی تیزی کے ساتھ فرار بھی کرجاتے ہو۔ تمہاری اطاعت جسقدر سہل ہے اور تمہاری ارادت جتنی سستی، اتنا ہی تمہاری انحراف آسان ہے، اور اسی نسبت سے تمہاری مخالفت بھی ارزان ہے۔ پس نہ تو تمہاری تحسین کی کوئی قیمت، نہ تمہاری توحین کا کوئی وزن۔ نہ تمہارے پاس دماغ ہے نہ دل۔ و سارس ہیں جنکو تم افکار سمجھتے ہو۔ خطرات ہیں جنکو تم عزائم کہتے ہو۔ خدا را بتلاؤ! میں تمہارے ساتھ کیا کروں؟ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ آج جن باتوں کیلئے تم رو رہے ہو، یہ بھی باتیں ہیں جو ایک زمانے میں میری زبان سے فریاد کا اضطراب اور طلب کی چیخ بنکر نکلتی تھیں، مگر تمہارے سینے کے اندر پتھر کا ایک ٹکرہ ہے، اس سے ٹکرا ٹکرا کر واپس آ جاتی تھیں، اور تم یقلم انکار و اعراض میں غرق تھے؟

تم نے ہمیشہ اعراض کیا۔ تم نے اعراض ہی نہیں کیا، بلکہ

جعلوا اصابعهم فی اذانہم، و استغشوا ثیابہم، و امررا، و استکبرا استکبارا [۷ : ۷۱] کی ساری سنتیں غفلت و انکار کی تازہ کردیں۔ میں نے تم میں سے ہر گروہ کو تولا۔ میں نے دلوں اور دلوں کا ایک ایک گوشہ

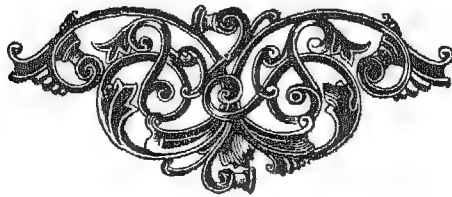
چہاں مازا - جب کبھی کوئی بہتر دیکھی ، فریاد گی - جب کبھی انسانوں کو دیکھا اپنی طرف بلایا - لیکن فلم یزد ہم دعائی الافراد [۷۱ : ۶] بہت کم ررحیں ایسی نکلیں جنکو حقیقت کا فہم ہو ، اور بہت کم دل ایسے ملے جو طلب و عشق سے معمور ہوں - یہاں تک کہ میں تمہاری آبادیوں سے الگ ہو کر رانچی کے گوشہ قید و بند میں چلا گیا ، اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ وہاں بھی میری صبحیں اور میری شامیں کن فکروں اور کاموں میں بسر ہوتی رہیں - اب میں پھر تم میں واپس آ گیا ہوں - لیکن تمہاری بہتریں اور غولوں میں سچی جستجو کا چہرہ اسی طرح مفقود ہے ، جیسا کہ ہمیشہ سے مفقود رہا ہے - اب تک حقیقت شناسی کی کوئی گیرائی تم میں نظر نہیں آتی - تم مجھے بلاتے ہو کہ استقبال سے بھرے ہوئے ریلوے اسٹیشنوں پر اُتارو ، اور ایسے پرورش انسانوں کے نعرے سناؤ جنکے ہاتھوں میں فتح مند فوجوں کی طرح جھنڈیاں ہوں ، اور پھر اتلے انسان میری گاڑی کے چاروں طرف اکٹھے کر دو کہ اُنکے ہجوم میں دو چار آدمیوں کا خون ہو جائے ، مگر آہ ! میں تمہاری ان بہتریں کو لپک کر کیا کروں جب تمہارے دلوں میں سناتا چھایا ہوا ہے ، اور تمہارے اس جوش استقبال سے مجھے کیا خوشی ہو جب تمہاری ررحیں موت کی افسردگی سے مرجھائی ہوئی ہیں - افسوس ! تم میں کوئی نہیں جو میری زبان سمجھتا ہو - تم میں کوئی نہیں جو میرا شناسا ہو - میں سچ سچ کہتا ہوں کہ تمہارے اس پورے ملک میں ایک بے یار و آشنا غریب الوطن ہوں :

مسن بہر جمعیتے نالان شدم * جفت خوشحالان ربہ حالان شدم
ہر کسے از ظن خود شد یار مسن * رز درون من نہ جست اسرار من
سر مسن از نالۂ مسن دور نیست * لیک کس را گوش آن منظور نیست

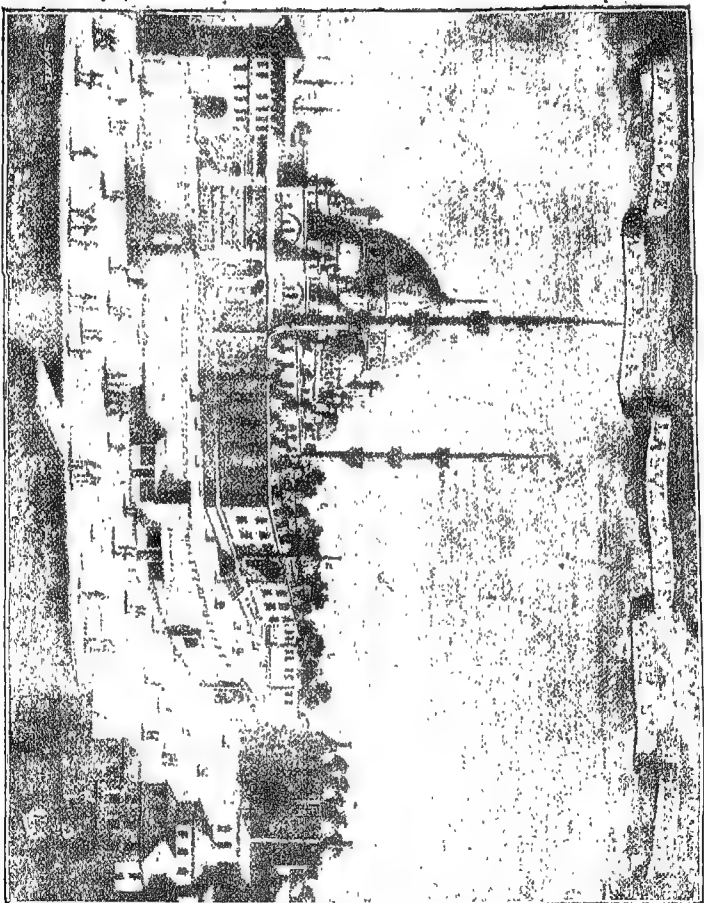
میری راہوں میں نہ کبھی تبدیلی ہوئی نہ میرے سفر میں کبھی یمن و یسار کا تذبذب پیش آیا ہے - تبدیلیاں فکروں میں ہوسکتی ہیں ، قیاسوں میں ہوسکتی ہیں ، پولیٹکل حکمت عملیوں میں ہوسکتی ہیں ، انسانی تقلید اسکا سرچشمہ ہے ، اور انسانوں اور قوموں کا اتباع اسکا منبع ہے ، لیکن اُن عقائد میں کبھی تبدیلی نہیں ہوسکتی جو روحی و تنزیل کی اُقل اور دائمی ہدایتوں سے ماخوذ ہوں - الحمد للہ کہ میں جو کچھ کہتا اور کرتا رہا ، وہ میرے عقائد و معلومات تھے ، تمہارے بتوں کی طرح سارا

و مظلونات نہ تھے - و ان الظن لا یغنی عن الحق شیئاً (۵۴ : ۳) اسوقت
 تم میں سے اکثروں نے اعراض کیا ، بہتوں نے استہزاء کیا ، کتنوں ہی نے
 کہہ دیا کہ یہ ایک طرح کی مذہبی بناوت اور ما فوق الفطرۃ دعویٰ کا اعلان ہے :
 یرید ان ینفضل علینا - بعضوں نے تو فیصلہ ہی کر دیا کہ یہ صرف فصاحت
 و بلاغت کی ساحری اور ادیبانہ افسونگری ہے : اکتتبہا فہی تملي علیہ
 بکرة و اصیلا (۲۵ : ۷) لیکن دیکھو ! بالآخر رفتہ رفتہ سب نے اپنی جگہیں
 چھوڑ دیں - سب اُسی راہ پر چل پڑے - بہتوں نے دانستہ ، اور بہتوں نے
 نادانستہ ، مگر راہ سب نے وہی اختیار کی - آج تم سب اُسی ” ما فوق
 الفطرۃ دعویٰ “ اور ” ساحرانہ فصاحت طرازیوں “ کو اپنا اصل الاصول بنائے
 ہوئے ہو ، اور ” قیام شریعت “ اور ” تقدیم و اتباع مذہب “ کے ناموں سے
 اسے موسوم کرتے ہو -

پس جبکہ یہ تجربہ و مشاہدہ تمہارے سامنے ہے ، تو آج میں اعلان کرتا
 ہوں کہ دوسرے تجربہ کا رقت آگیا - راہ عمل کیلئے تمہارا رخ وہ ہے جسکی
 طرف درڑ رہے ہو - اور میری راہ وہ ہے جسکی طرف پچھلے صفحوں میں
 بلا چکا ہوں - تم بارش کے رجوں سے انکار تو نہیں کیا کرتے ، مگر منتظر رہتے ہو
 کہ پانی برسنے لگ جائے تو اقرار کریں ، لیکن میں ہواؤں میں پانی کی بو
 سونگھ لینے کا خوگر ہوں ، اور صرف بادلوں ہی کو دیکھ لینا میرے علم
 کیلئے کافی ہے - پس اگر پچھلا تجربہ کافی ہے تو اس سے عبرت پکڑو ،
 اور اگر ابھی آؤ انتظار کرنا چاہتے ہو تو انتظار کر دیکھو - فستذ کسرون ما
 اقول لکم ، و افرض امری الی اللہ - ان اللہ بصیر بالعباد (۴۰ : ۴۷)

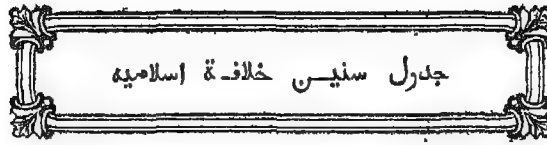


ایدریا نوبل کی جامع سلیم کا دیرزنی منظر



نام نہاد مجلس صلح فیصلہ کرنا چاہتی ہے کہ رلیٹ ایڈریا نوبل کو
قسطانہ سے الگ کر دیا جائے

ضـمـمـة



عدد	خلفاء	سنة هجري	سنة مسيحي
١	ابوبكر الصديق (رض)	١١	٦٣٢
٢	عمر بن الخطاب (رض)	١٣	٦٣٤
٣	عثمان بن عفان (رض)	٢٣	٦٤٤
٤	علي بن ابي طالب (رض)	٣٥	٦٥٢

سلسلة بنو امية

٥	معوية بن ابي سفيان	٤١	٦٦١
٦	يزيد بن معوية	٦٠	٦٨٠
٧	معوية بن يزيد	٦٤	٦٨٣
٨	مرزان بن الحكم	٦٤	٦٨٣
٩	عبد الملك بن مروان	٦٥	٦٨٤
١٠	الوليد بن عبد الملك	٨٦	٧٠٥
١١	سليمان بن عبد الملك	٩٦	٧١٤
١٢	عمر بن عبد العزيز	٩٩	٧١٧
١٣	يزيد بن عبد الملك	١٠١	٧١٩
١٤	هشام بن عبد الملك	١٠٥	٧٢٣
١٥	الوليد بن يزيد بن عبد الملك	١٢٥	٧٤٢
١٦	يزيد بن الوليد	١٢٦	٧٤٣
١٧	ابراهيم بن الوليد	١٢٦	٧٤٣
١٨	مرزان بن محمد بن مروان	١٢٧	٧٤٤

سلسلة عباسية

١٩	ابو العباس سفيان	١٣٢	٧٥٩
٢٠	ابو جعفر منصور	١٣٧	٧٥٤
٢١	المهدي بن منصور	١٥٨	٧٧٥

٧٨٥	١٦٩	الهادي بن المهدي	٢٢
٧٨٦	١٧٠	هارون الرشيد بن المهدي	٢٣
٨٠٨	١٩٣	محمد الأمين بن هارون	٢٤
٨١٣	١٩٨	المأمون بن هارون	٢٥
٨٣٣	٢١٨	المعتصم بن هارون	٢٦
٨٤٢	٢٢٧	الرائق بن المعتصم	٢٧
٨٤٧	٢٣٢	المتوكل على الله بن المعتصم	٢٨
٨٦١	٢٤٧	<u>المستنصر بالله بن المتوكل</u>	٢٩
٨٦٢	٢٤٨	المستعين بالله بن المعتصم	٣٠
٨٦٦	٢٥٢	المعتز بالله بن المتوكل	٣١
٨٦٩	٢٥٥	المهتدي بالله بن الرائق	٣٢
٨٧٠	٢٥٦	المعتمد بالله بن المتوكل	٣٣
٨٩٢	٢٧٩	المعتضد بالله بن الموفق	٣٤
٩٠٨	٢٩٥	المقتدر بالله بن الموفق	٣٥
٩٣٣	٣٢٢	الراضي بالله بن المقتدر	٣٦
٩٤٥	٣٢٩	المقتفي بالله بن المقتدر	٣٧
٩٤٤	٣٣٣	المستفي بالله بن المقتفي	٣٨
٩٤٦	٣٣٣	المطيع بالله بن المقتدر	٣٩
٩٧٥	٣٤٣	الطائع لله بن المطيع	٤٠
٩٩١	٣٨١	القادر بالله بن المقتدر	٤١
١٠٣١	٤٣٢	القائم بامر الله بن القادر	٤٢
١٠٧٥	٤٦٧	المقتدي بالله بن القائم	٤٣
١٠٩٣	٤٨٧	المستظهر بالله بن المقتدي	٤٤
١١١٨	٥١٢	المسترشد بالله بن المستظهر	٤٥
١١٣٥	٥٢٩	الراشد بن المسترشد	٤٦
١١٣٦	٥٣٠	المقنقي بن المستظهر	٤٧
١١٦٠	٥٥٥	المستنجد بالله بن المقنقي	٤٨
١١٧٠	٥٦٦	المستضي بنور الله بن المستنجد	٤٩
١١٨٠	٥٧٥	الناصر لدين الله بن المستضي	٥٠
١٢٢٥	٦٦٢	الظاهر بالله بن الناصر	٥١

١٢٢٣	٩٢٣	المستنصر بالله بن الظاهر	٥٢
١٢٤٣	٩٤٠	المستعصم بالله بن المستنصر	٥٣

عيسى مصر

١٢٥٨	٩٥٩	المستنصر بالله	٥٤
١٢٦٢	٩٩١	الحاكم بامر الله	٥٥
١٣٠١	٧٠١	المستكفي بالله	٥٦
١٣٣٩	٧٣٠	الرائق بالله	٥٧
١٣٥١	٧٤٢	الحاكم بامر الله	٥٨
١٣٥٢	٧٥٣	المعتضد بالله	٥٩
١٣٦١	٧٦٣	المتوكل على الله	٦٠
١٣٨٣	٧٨٥	الرائق بالله	٦١
١٤٠١	٨٠٨	المستعين بالله	٦٢
١٤١٢	٨١٥	المعتضد بالله	٦٣
١٤٤١	٨٣٠	المستكفي بالله	٦٤
١٤٥٠	٨٤٣	القائم بامر الله	٦٥
١٤٥٣	٨٥٩	المستنجد بالله	٦٦
١٤٧٩	٨٨٣	المتوكل على الله	٦٧
١٤٩٧	٩٠٣	المستمسك بالله	٦٨
١٥٠٦	٩١٢	المتوكل على الله	٦٩

~~~~~  
سلسلة عثمانية

|      |      |              |    |
|------|------|--------------|----|
| ١٥١٧ | ٩٢٣  | سليم خان اول | ٧٠ |
| ١٥٢٠ | ٩٢٦  | سليمان اول   | ٧١ |
| ١٥٦٦ | ٩٧٤  | سليم ثاني    | ٧٢ |
| ١٥٧٤ | ٩٥٢  | مراد ثالث    | ٧٣ |
| ١٥٩٦ | ١٠٠٤ | محمد ثالث    | ٧٤ |
| ١٦٠٤ | ١٠١٢ | احمد اول     | ٧٥ |
| ١٦١٨ | ١٠٢٧ | مصطفى اول    | ٧٦ |
| ١٦١٨ | ١٠٢٧ | عثمان ثاني   | ٧٧ |

|      |      |                                                                |    |
|------|------|----------------------------------------------------------------|----|
| ۱۶۲۳ | ۱۰۳۲ | مراد رابع                                                      | ۷۸ |
| ۱۶۴۰ | ۱۰۴۹ | ابراہیم اول                                                    | ۷۹ |
| ۱۶۷۴ | ۱۰۵۳ | محمد رابع                                                      | ۸۰ |
| ۱۶۸۷ | ۱۰۹۹ | سلیمان ثانی                                                    | ۸۱ |
| ۱۶۹۱ | ۱۱۰۲ | احمد ثانی                                                      | ۸۲ |
| ۱۶۹۵ | ۱۱۰۶ | مصطفیٰ ثانی                                                    | ۸۳ |
| ۱۷۰۳ | ۱۱۱۵ | احمد ثالث                                                      | ۸۴ |
| ۱۷۳۰ | ۱۱۴۲ | محمد اول                                                       | ۸۵ |
| ۱۷۵۴ | ۱۱۲۸ | عثمان ثالث                                                     | ۸۶ |
| ۱۷۵۷ | ۱۱۷۱ | مصطفیٰ ثالث                                                    | ۸۷ |
| ۱۷۷۳ | ۱۱۸۷ | عبد المجید اول                                                 | ۸۸ |
| ۱۷۸۹ | ۱۲۰۳ | سلیم ثالث                                                      | ۸۹ |
| ۱۸۰۷ | ۱۲۲۲ | مصطفیٰ رابع                                                    | ۹۰ |
| ۱۸۰۸ | ۱۲۲۳ | محمد ثانی                                                      | ۹۱ |
| ۱۸۳۹ | ۱۲۵۵ | عبد المجید                                                     | ۹۲ |
| ۱۸۶۱ | ۱۲۷۷ | عبد العزیز                                                     | ۹۳ |
| ۱۸۷۶ | ۱۲۹۳ | مراد خامس                                                      | ۹۴ |
| ۱۸۷۶ | ۱۲۹۳ | عبد الحمید ثانی                                                | ۹۵ |
|      |      | محمد خامس                                                      | ۹۶ |
|      |      | امیر المومنین السلطان محمد خاں سادس - خلد اللہ ملکہ و شریکتہ - | ۹۷ |

## تصحیح

صفحہ ۶۹ - سطر ۲۷ - میں ہے کہ حافظ عسقلانی اور قاضی عینی نے آٹھویں صدی میں بخاری کی شرحیں لکھیں - اسکو یوں پڑھنا چاہیے :  
 ” آٹھویں صدی یا نویں صدی کے اراکل میں “  
 صفحہ ۸۰ - سطر ۲۰ - میں ہے ” ہندوستان میں شہنشاہ اکبر کا زمانہ تھا “ یہ صحیح نہیں ہے - یوں پڑھنا چاہیے ” بابر کی قسمت آزمائیوں کا زمانہ تھا “  
 صفحہ ۵۳ اسطر ۱۵ کے آخری لفظ ” تمہاری “ کے بجائے ” تمہارا “ پڑھیے -  
 یہ رسالہ بالکل قلم برداشتہ لکھا گیا ہے - تحریر و طباعت دونوں کا سلسلہ ساٹھ ساتھ جاری رہا - نظر ثانی و مراجعت کتب کا بالکل مرقعہ نہ تھا - اسلیے اکبر کے زمانہ کی تعیین میں غلطی ہوگئی -

وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ، هُوَ  
اجْتَنَبَكُمْ، وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ  
مِنْ حَرَجٍ، مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ هُوَ  
سَمَّكُمْ الْمُسْلِمِينَ مِنْ قَبْلُ وَفِي هَذَا  
لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ، وَ  
تَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ فَأَقِيمُوا  
الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ، وَاعْتَصِمُوا  
بِاللَّهِ هُوَ مَوْلَاكُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلَى وَ  
نِعْمَ النَّصِيرُ (٢٢ : ٧٨)

جزیره العرب  
چشمی صدی یونانی

جزيرة العرب

جہتی صبی سیوین

